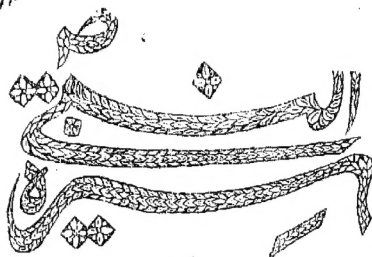


موصیٰ و وصیہ
علیہ السلام



یعنی

سوانح قدس حضرت زکام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد پنجم

میتل منصبت حضرت عبادا

جس میں پہلے عبادت کا منہم بتایا گیا ہے پھر نماز رکوع، روزہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاص

توکل، صبر اور شکر وغیرہ جانی و مالی و فنی عبادت کی تشریح اور ان کے احکام

و مصالح کی توضیح کی گئی ہے

تالیف

میر سلیمان ندوی

باہتمام مسود علی ندوی

مطبع رفیع مطبوعہ گڑھی
درمیا ہرام گڑھی

طبع اول

۱۳۵۲ھ
۱۹۳۵ء



فہرست مضامین سیرانی جلد پنجم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۵	ناز کی دعا،	۲۶	ثبات عبادت نہیں،	۱-۵	دیس صبا
۶۶	اس دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے	۲۸	عادت نشینی اور قطع علاقہ عبادت	۵-۱	عمل صالح
۶۷	انبیاء کی مخصوص دعاؤں سے،	۳۶	اسلام میں عبادت کا وسیع مفہم	۶-۱	ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت
۶۸	حضرت موسیٰ کی ناز کی دعا،	۳۸	عبادت چارگانہ اعمال چارگانہ	۷	اعمال صالح کی قسمیں،
۶۹	زبور میں حضرت داؤد کی ناز کی دعا،	۳۸-۱۴۷	ناز	۸-۳۷	عبادت،
۷۰	انجیل میں ناز کی دعا،	۴۰	توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم،	۸	اخلاق،
۷۱	ناز کیلئے تعیین اوقات کی ضرورت	۴۱	اسلام میں ناز کا مرتبہ،	۱۰	مسائلات،
۷۲	ناز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں	۴۲	ناز کی حقیقت	۱۱	عبادات
۷۳	ناز کے لئے مناسب ظہری اوقات	۴۳	ناز کی روحانی غرض و غایت،	۱۲	اسلام اور عبادت،
۷۴	ناز کے اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ،	۴۴	ناز کے لئے کچھ آداب و شرائط	۱۳	اسلامی عبادت کی خصوصیات
۷۵	اسلام میں طریق و اوقات ناز،	۴۵	کی ضرورت،	۱۴	صرف ایک خدا کی عبادت
۷۶	نازوں کی پابندی و نگرانی،	۴۶	ذکر و دعا و بیح کے دو طریقے،	۱۵	خارجی رسوم کا وجود نہیں،
۷۷	ناز کے اوقات شریفین،	۴۷	ناز متحدہ طریق عبادت کا نام ہی	۱۶	درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں،
۷۸	وہ اوقات کیا ہیں،	۴۸	ناز میں نظام وحدت کا اصول،	۱۷	خارجی کثرت کی کوئی چیز نہیں،
۷۹	اوقات کی تکمیل،	۴۹	ناز میں جہانی حرکات،	۱۸	مکان کی قید نہیں،
۸۰	نازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل،	۵۰	ارکان ناز،	۱۹	انسانی قربانی کی مانگت،
۸۱	ایک نکتہ،	۵۱	قیام،	۲۰	حیوانی قربانی میں اصلاح،
۸۲	بیمین الصلوٰۃ میں،	۵۲	رکوع،	۲۱	مشترک قربانیوں کی مانگت،
۸۳	اوقات بیچگانہ اور آیت اسراء،	۵۳	سجدہ،	۲۲	بخیر و ترک لذت و ریاضات اور کثرت
۸۴	دل کو کی تحقیق،	۵۴	ناز تمام جہانی احکام عبادت کا مجموعہ		
۸۵	اوقات ناز کا ایک اور راز،				

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۷۳	دو طرفہ تہذیب و تمدن میں ترجیح	۱۳۴	افت و محبت	۹۸	اوقات پنجگاہ کی ایک اور آیت
۱۷۵	اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہنگامہ	۱۳۵	غفاری	۹۹	اطراف النہار کی تحقیق
۱۷۷	سیکشن، فقیروں اور محذوروں کی امداد	۱۳۶	اتہامیت	۱۰۰	ایک اور طریقہ ثبوت
۱۷۸	غلامی کا افساد	۱۳۷	کاموں کا تنوع	۱۰۱	نماز پنجگاہ احادیث و سنت میں
۱۷۹	جامعی کاموں کے اخراجات کی تدبیر	۱۳۸	ترتیب	۱۰۲	تجدید بقیہ ہوگی، لیکن کیوں
۱۸۰	زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات	۱۳۹	نظم جماعت	۱۰۳	قبیلہ
۱۸۱	تزکیہ نفس	۱۴۰	ساواست	۱۰۴	رکعتوں کی تعداد
۱۸۲	باجی اعانت کی عملی تدبیر	۱۴۱	مرکزی افاعت	۱۰۵	نماز کے آداب باطنی
۱۸۵	دو ہفتہ کی بیماریوں کا علاج	۱۴۲	معیار فضیلت	۱۰۶	اقامت صلوٰۃ
۱۸۷	اشتراکیت کا علاج	۱۴۳	رفقاء کی مجلس عمومی	۱۰۷	قوت
۱۸۸	اقتصادی اور تجارتی فائدے	۱۴۴	عرب کی روحانی کاپالٹ	۱۰۸	خضوع
۱۸۹	فقر کی اصلاح	۱۴۵	زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم	۱۰۹	تبتل
۱۹۰	صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتہً خواجہ اللہ	۱۴۶	زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں	۱۱۰	تضرع
۱۹۱	اداکار بنائے	۱۴۷	اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت	۱۱۱	اخلاص
۱۹۲	صدقہ چھپا کر دیا جائے	۱۴۸	زکوٰۃ کا آغاز اور تدبیر کی تکمیل	۱۱۲	ذکر
۱۹۳	بلند ہمتی اور عالی حیالی	۱۴۹	زکوٰۃ کی مدت کی تعیین	۱۱۳	فہم و تدبیر
۱۹۴	فقر اور مساکین کی اخلاقی اصلاح	۱۵۰	زکوٰۃ کی مہر	۱۱۴	نماز کے خلاف بدعتی اور معاشرتی فائدے
۱۹۵	روزہ کا مفہوم	۱۵۱	اتفاق	۱۱۵	ستر پوشی
۱۹۶	روزہ کی ابتدائی تاریخ	۱۵۲	زکوٰۃ	۱۱۶	ہمارت
۱۹۷	روزہ کی مذہبی تاریخ	۱۵۳	نگتہ	۱۱۷	صفائی
۱۹۸	روزہ کی حقیقت	۱۵۴	جانوروں پر زکوٰۃ	۱۱۸	پابندی وقت
۱۹۹	رمضان کی ماہیت	۱۵۵	نصاب مال کی تعیین	۱۱۹	صحیح خیسیزی
۲۰۰		۱۵۶	زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں	۱۲۰	خدا کا خوف
۲۰۱		۱۵۷	اصلاحات	۱۲۱	ہشیادہی
۲۰۲		۱۵۸		۱۲۲	مسلمان کا امتیازی نشان
۲۰۳		۱۵۹		۱۲۳	جنگ کی تدبیر
۲۰۴		۱۶۰		۱۲۴	دینی تہذیب اور بیماری
۲۰۵		۱۶۱			
۲۰۶		۱۶۲			
۲۰۷		۱۶۳			
۲۰۸		۱۶۴			
۲۰۹		۱۶۵			
۲۱۰		۱۶۶			
۲۱۱		۱۶۷			
۲۱۲		۱۶۸			
۲۱۳		۱۶۹			
۲۱۴		۱۷۰			
۲۱۵		۱۷۱			
۲۱۶		۱۷۲			
۲۱۷		۱۷۳			
۲۱۸		۱۷۴			
۲۱۹		۱۷۵			
۲۲۰		۱۷۶			
۲۲۱		۱۷۷			
۲۲۲		۱۷۸			
۲۲۳		۱۷۹			
۲۲۴		۱۸۰			
۲۲۵		۱۸۱			
۲۲۶		۱۸۲			
۲۲۷		۱۸۳			
۲۲۸		۱۸۴			
۲۲۹		۱۸۵			
۲۳۰		۱۸۶			
۲۳۱		۱۸۷			
۲۳۲		۱۸۸			
۲۳۳		۱۸۹			
۲۳۴		۱۹۰			
۲۳۵		۱۹۱			
۲۳۶		۱۹۲			
۲۳۷		۱۹۳			
۲۳۸		۱۹۴			
۲۳۹		۱۹۵			
۲۴۰		۱۹۶			
۲۴۱		۱۹۷			
۲۴۲		۱۹۸			
۲۴۳		۱۹۹			
۲۴۴		۲۰۰			
۲۴۵		۲۰۱			
۲۴۶		۲۰۲			
۲۴۷		۲۰۳			
۲۴۸		۲۰۴			
۲۴۹		۲۰۵			
۲۵۰		۲۰۶			
۲۵۱		۲۰۷			
۲۵۲		۲۰۸			
۲۵۳		۲۰۹			
۲۵۴		۲۱۰			
۲۵۵		۲۱۱			
۲۵۶		۲۱۲			
۲۵۷		۲۱۳			
۲۵۸		۲۱۴			
۲۵۹		۲۱۵			
۲۶۰		۲۱۶			
۲۶۱		۲۱۷			
۲۶۲		۲۱۸			
۲۶۳		۲۱۹			
۲۶۴		۲۲۰			
۲۶۵		۲۲۱			
۲۶۶		۲۲۲			
۲۶۷		۲۲۳			
۲۶۸		۲۲۴			
۲۶۹		۲۲۵			
۲۷۰		۲۲۶			
۲۷۱		۲۲۷			
۲۷۲		۲۲۸			
۲۷۳		۲۲۹			
۲۷۴		۲۳۰			
۲۷۵		۲۳۱			
۲۷۶		۲۳۲			
۲۷۷		۲۳۳			
۲۷۸		۲۳۴			
۲۷۹		۲۳۵			
۲۸۰		۲۳۶			
۲۸۱		۲۳۷			
۲۸۲		۲۳۸			
۲۸۳		۲۳۹			
۲۸۴		۲۴۰			
۲۸۵		۲۴۱			
۲۸۶		۲۴۲			
۲۸۷		۲۴۳			
۲۸۸		۲۴۴			
۲۸۹		۲۴۵			
۲۹۰		۲۴۶			
۲۹۱		۲۴۷			
۲۹۲		۲۴۸			
۲۹۳		۲۴۹			
۲۹۴		۲۵۰			
۲۹۵		۲۵۱			
۲۹۶		۲۵۲			
۲۹۷		۲۵۳			
۲۹۸		۲۵۴			
۲۹۹		۲۵۵			
۳۰۰		۲۵۶			

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۰۵	جہاد بالمال،	۲۴۰	جہاد کا اسلام،	۲۱۹	فضیلتِ صیام کا مناسب موقع
۳۰۶	سہر نیک کام جہاد ہے،	۲۴۱	صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا،	۲۲۰	ایامِ روزہ کی تحدید،
۳۰۷	جہاد بالنفس،	۲۴۲	دوقب عوف،	۲۲۱	ایک نکتہ،
۳۰۹	دائمی جہاد،	۲۴۳	قیامِ مزدلفہ،	۲۲۲	روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب،
	عباداتِ قلبی	"	منی کا قیام،	۲۲۵	روزہ میں اصلاحات،
	۳۱۰ - ۳۴۷	۲۴۴	قصر بانی،	۲۲۶	روزہ کے مقاصد،
۳۱۱	تقویٰ،	"	حقِ راس،	۲۳۱	حائلِ قرآن کی پیروی،
"	افلاس،	۲۴۵	ری جار،	۲۳۲	شکریہ،
"	توکل،	۲۴۶	ان رسوم کی غایت،	"	تقویٰ،
"	صبر،	۲۴۷	حج کے آداب،	۲۳۳	حج
"	شکر،	۲۴۸	حج کی مسکتین اور مکتین،	۲۳۴	۲۹۸ - ۲۴۲
	تقویٰ	۲۴۹	مرکزیت،		کلمہ
	۳۱۱ - ۳۱۹	۲۵۰	رزقِ ثمرات،	۲۳۵	بیت اللہ،
۳۱۱	تقویٰ سارے اسلامی احکام کی	۲۵۱	قربانی کی اقتصادی حیثیت،	۲۳۶	حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کے
	غایت ہے،	۲۵۲	ابراہیمی دعا کی مقبولیت،	۲۳۷	شرائط،
۳۱۳	اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے	۲۵۳	تجارت،	"	قبت ابراہیمی کی حقیقت قربانی پر
	مستحق ہیں،	۲۵۴	روحانیت،	۲۳۸	اسلام قربانی ہے۔
"	کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے،	۲۵۵	تاریخیت،	۲۳۹	یہ قربانی کمان ہوئی،
۳۱۳	اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں،	۲۵۶	خاص روحانیت،	۲۴۰	کہ اور کعبہ،
"	سیت الی سے سرفراز ہیں،	۲۵۷	حج میرور،	۲۵۱	حج ابراہیمی یا دگا رہے،
۳۱۵	قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے،		جہاد	۲۵۵	حج کی حقیقت،
"	تقویٰ والے کون ہیں،	۲۵۹ - ۲۹۹	لفظ جہاد کی تشریح،	۲۶۰	حج کے ارکان،
۳۱۶	تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟	۲۶۱	جہاد کی تین،	۲۶۱	احرام،
۳۱۸	اسلام میں برتری کا	"	جہاد اکبر،	۲۶۲	طواف،
	معیار،	۳۰۲	جہاد باطنی،	"	

صفحہ	مضون	صفحہ	مضون	صفحہ	مضون
۳۵۶	شکر کی تعریف،	۳۴۸	وقت مناسب کا انتظار کرنا،	۳۲۰	اخلاص ۳۲۰-۳۲۴
"	لفظ کفر کی تشریح،	۳۴۰	بے قرار نہ ہونا،		
۳۵۷	شکر، اصل ایمان ہے،	۳۴۱	مشکلات کو خاطر میں نہ لانا،		توکل ۳۲۵-۳۳۶
۳۵۸	حمد،	۳۴۲	درگزر کرنا،		
۳۶۰	جہانی نعمتوں کا شکریہ،	۳۴۴	ثابت قدمی،	۳۲۵	توکل کے غلط معنی، توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح،
۳۶۱	مالی نعمتوں کا شکریہ،	۳۴۹	ضبط نفس،		
۳۶۲	احسان کا شکریہ احسان ہے،	۳۴۹	ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا،	۳۲۵	صبر ۳۳۷-۳۵۵
۳۶۸	جامعہ،	۳۵۲	صبر کے فضائل اور انعامات،	۳۲۵	
		۳۵۴	فتح مشکلات کی کئی مہر اور دعا،	۳۲۷	صبر کے لغوی معنی،
			شکر ۳۴۷-۳۵۶		

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مُحَمَّدٌ رَسُولاً لَّهُمْ خَلَقَهُمْ بِصُفْوَى وَكَانَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ وَلِلَّهِ الدِّينُ كُلُّهُ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ

دِیَاچہ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی جلد سیرۃ الاولیاء میں شائع ہوئی تھی آج تین سال کے بعد اُس کی پانچواں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنگا رندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے، اور اپنے بندوں کے دلوں کو اُس کے حق قبول کے لیے کھول دیا ہے،

موضوع | اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت، اور اسلام میں اُس کے وہ اقسام اور ان میں سے ہر ایک کی وہ صلیحت و حکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہر کے اسباق کی تکمیل اور ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطا کا قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے، جو صراطِ مستقیم ہے، اور وہ سرِ شمسِ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقی ہے، تاہم وہی کتنا جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے (خدا اُن سے راضی ہو) فرمایا کہ جو بات کہی گئی ہے اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے، اور

خط سب سے تو نفسِ خطا کا کار کا قصور ہے

ان جلدوں کا سیرۃ تعلق ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کہی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی

اور سیر کے واقعات سے نہیں، جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں، بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہو، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دونوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا، اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں، اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔ اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان جبرائیس کا کہ فیروہ کی ہے جس کا خیال حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا، ان زبانی بیانون اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں،

چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں، یعنی تمام تہات مسائل پر یورپ، قرآن مجید پر یورپی نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسانیکلو پیڈیا، اور نام بھی دائرۃ المعارف البنیویہ موزون ہوگا، گو کہا ہے، اور ابھی میں فیصلہ نہیں کیا، (بنام مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مدظلہ)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ میں انھوں نے ان حصوں کا عنوان منصب نبوت رکھا تھا، اور لکھا تھا، دوسرے حصہ منصب نبوت سے متعلق ہی نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال، اور اخلاق، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل، اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض، خمسہ، اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تقریرات کی تفصیل تاریخ، اور ان کے مصالح اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد و اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے کافی ہو سکتا ہے، (جلد اول طبع اول حصہ و طبع دوم صحیف)

گذشتہ چوتھی جلد یہ پانچویں جلد اور آئندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں، منصب نبوت، عربیہ کی گذشتہ حالت، اور تعلیم عقائد، چوتھی جلد کا موضوع تھی، اور فرائض محمدان کی تشریح اور تکمیل، اس جلد کا عنوان ہے، اخلاق و معاشرت کے مکمل کے لیے چوتھی جلد اور البقیہ اوامر و نواہی کی

جو معاملات سے متعلق ہیں، اساتوین جلد ہوگی، ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح میں مصنفین اول کے یا
 کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، ان کی مسئلوں اور بحثوں
 پر رد اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے، اور ہر ایک بحث
 کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے، اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کیلئے کافی
 و رہنمائی نہ ملتی ہوگی۔

انچہ استاد "مرا" گفت ہان می گویم

من قبل | اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حق قبول کی سند عطا فرمائی،

قبول خاطر و لہذا داد و استی دادم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدمہ بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی
 اور جن کی زبان سے انتھاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا، "یہ کتاب وہاں قبول ہوگئی ہوگی
 اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی، علاوہ اس کے کہ اسکی ہر جلد کے کئی کئی اوشن شائع ہو چکے ہیں
 اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شہینگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی میں اس کی تین جلدیں
 کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا، فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں، اور اب تک مستطیع بن اور
 سب بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے،

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے، کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اس زبان
 میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توہم کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ
 اس کو سامنے رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں، اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہامی زبان میں محمد اللہ پیدا ہوگیا
 اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے،

اس لئے اسلام کی اصلاح اس کتاب کے حق قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ بنی

شائع کیا، اس کی خدمت کے لیے لینک کی سب سے پہلی آواز اس خیر سہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر توفیق و نصیب
 صلح کے دامن سے وابستہ تھا یعنی تبت تبت تبت تبت کی خادمہ اور امت تبت تبت کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہان
 بیگم سابق فرمانروائے کشمیر و بھوپال، (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۲ء میں مصنف کی وفات
 پر خیال گذر کہ شاید یہ توجہ جہاں کی باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مرچکا، بلکہ اس خدا کیلئے
 محتاج کو موت نہیں، اس لیے اپنی شاہانہ ماہوار ادوار برابر جاری رکھی، مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق
 ایک قطعہ لکھا تھا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر وقت کہ ابر فیض سلطان جہان بیگم زرقاں ہوں
 رہی تالیف و تصنیف و روایتاے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر مرادوں ہماری چاہوں
 غرض دو ہاتھ میں اس کام کے انجام میں شامل
 کہ جن میں ایک فقیر بیٹا ہے، ایک سلطان

جب اس فقیر نے نواکی وفات ہوئی، تو سرکار عالیہ نے بڑے دروسے فرمایا تھا کہ فقیر بیٹا تو پہل بسا، اب
 سلطان کی باری ہے آخر یہ سلطان بھی پہل بسیں، اور تالیف و تصنیف روایت کے ساتھ ساتھ زرقاں فانی کے کام
 کی نامائی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فرووس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت
 ایک ایسے جوان محبت کے سپرد کر گئیں، جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے تمام کارناموں
 کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھایا، اور سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، بسکند صولت افتخار الملک
 حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شفاء
 برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ است و ملت کی سینکڑوں آرزوین پرورش پارہی ہیں، خدا اللہ ملکہ
 ۱۹۱۲ء میں سیرت کی پہلی جلد حب پیکر شائع ہوئی، تو جامع نے اس کا ایک نسخہ حضرت آصفیہ صاحبہ
 مظفر الملک، الملک نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن علی اللہ ملکہ کی پیشکش و خسروی میں پیش کیا، حضور صرح

اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات، فخر موجودات سید المرسلین محبوب رب العالمین امیر مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ السلام و الصلوٰت کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہی سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و مطمئن ہوئے اور دوسری جلد و ن کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دُود و برس کے لیے تین دفعہ اور تین برس کے لیے ایک دفعہ دو سو بار جاری فرمائے جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا یہ مدد ملی اللہ تبارک تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز میں التجا جو کہ وہ باقی جلد و ن کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عطا فرمائے زندگی کی پیمائش سے زیادہ منزلیں طے کر چکا جو کچھ باقی ہے، دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے، اور آخرین خوش قیمت سجدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے،

منزل تمام گشت و بیابان رسید عمر ماہچنان در اول و صف تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گڑھ

۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عملِ صالح

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لیکر آئے، اُسکا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک ایمان، اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی، اب یہ تیسری نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان میں ہے، ایمان بنیادی اصولوں پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے، اور عملِ صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا کسی بات کا تنہا علم و یقین کا سیاسی کے لئے کافی نہیں جب تک اُس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو،

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انھیں دو چیزوں یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عملِ صالح کو نہیں، حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عکاسانِ اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے، اور عملِ صالح اس پر قائم شدہ و دیوارِ استون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوارِ استون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی،

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے، ایمان کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ

ہم نے بغیر قیاس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے، لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول مستعار نہ کو تسلیم کر لیا جائے
مابقی شکلوں کا عمل نہ کیا جائے، تو فرق تمیز و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کا رہتا
اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں،

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے
انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسویں آیتوں میں بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثنا ایمان اور
پراسکوئی قرار دیا ہے، اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور اصل صلاح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا
إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ ۚ إِنَّ الَّذِيْنَ
زمانہ اپنی پوری انسانی تاریخ کے گواہ کہ انسان کلمۃ
الصلٰحۃ، (عصر - ۱۱) میں ہی، لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے،

انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہدِ عدل ہے کہ انھیں افراد اور قوموں پر فو و فلاح اور کامیابی کے
انی حقائق کا یقین تھا، اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک

فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۚ ثُمَّ

، إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ ۚ

بِرَّكَ عَلَيْهِمْ مَسْمُوعُونَ، (واللین - ۱) اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوریاں

ت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اکی بدترین منزل تک پہنچ

اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہیں، وہ نہیں ایمان کی نصرت اور صلاح

دیہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہو رہی فرمایا،

لَوْ أَنَّ الصَّالِحِیْنَ أَذْكُرُ ۖ

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، وہی بہشت والے

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے جو شخص جنت کی قیمت ادا کر گیا، وہ اسی کی ملکیت ہوا، فرمایا،

إِنَّ الدِّينَ أَمْنٌ وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّالِحِينَ
وَالنَّصْرَ عِزٌّ مِنَ اللَّهِ وَالْيَوْمَ الْآخِرُ عَمَلٌ
صَالِحٌ فَلَا حُفُوفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں، اور صالحین اور نصاریٰ جو کوئی انڈر پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو انہیں ڈر ہے، نہ وہ غم کی باتیں گئے،

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب ملت کی فطرتی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الہی پر تعین لائے، اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نیکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون جو جہین نہ کیسی بال برابر فرق ہوا، اور نہ ہوگا، چنانچہ دو ائمہ قرین کی زبان یہ فرمایا،

قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نَعَذِّبُهُ، ثُمَّ يُرَدُّ
إِلَى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُ بَدَأَ نَكَلًا، وَأَمَّا مَنْ آمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ الْحُسْنَى،
اس نے کہا جو کوئی ظلم کا کام کرے گا تو ہم اس کو دنیا میں ہزار
دینگے، پھر وہ اپنے رب کے پاس واپس آئے گا تو اس کو بری
طرح سزا دیگا، اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اسے
لئے جہنم کی بدلہ ہے،

(کھف - ۱۱)

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا
كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ، وَإِنَّ آلَاءَهُ كَافٍ
خَلَفَ مَنْ بَعْدَ هَمْ خَلَفَتْ أَصَاعُوا الصَّلَاةَ
وَأَتَّبَعُوا السُّنَنَ فَمَنْ يَلْقَوْنَ غَيًّا إِلَّا لَمَنْ
تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاولئك يَدْخُلُونَ
تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوں گے جنہوں نے نہ
کوہا دیا، اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی، تو وہ گمراہ
سے ملین گئے، لیکن جسے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام

(انبیاء - ۷)

الْجَنَّةُ وَلَا يَطْلُمُونَ شَيْئًا

کئے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہو گئے اور ان کا ذرا ساق

(سورہ یس ۴۲)

یعنی مارا نہ جائے گا،

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہو کہ جنت کا استحقاق دراصل انہیں کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں، اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الایہ کہ اللہ تعالیٰ بخش فرمائے،

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَةٍ
الْجَنَّةِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ
هُوَ الْفَضْلُ الْعَظِيمُ ذَٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ
عِبَادًا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ رِزْقًا
دوسری جگہ فرمایا،

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ
جَنَّةٌ أَلْفُ رَوْسٍ مُّزَلَّاتٍ (کہت ۱۲)
کے لئے باغ فردوس ہیں،
پھر آگے چل کر فرمایا،

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا
صَالِحًا وَلَا يُتَرَفِّعْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (کہت)
ایمان کے ہوتے عمل سے عروجی توقع فرمیں جو درحقیقت تو یہ ہو کہ جہان عمل کی کمی ہی اس کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری کو چھٹی
پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا، انسانی فطرت کے خلاف ہو، آگ کو جلانے والی آگ نہیں کر لیتے
کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے، لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بٹا
اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا تصور ہمارے یقین کی کمزوری کا لازماً فاش کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ تمنا ایمان، یا تمنا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے،

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتٍ مُّجْتَمِعِينَ (سجۃ) تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے،

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۴ موعنون پر یہ آیت ہے،

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے،

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے

سے الگ نہیں ہو سکتے، اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ ربہ میں پہلے کو

دوسرے پر تقدم حاصل ہے،

جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا جو وہ بھی وہی جن میں ایمان کے ساتھ

عمل صالح بھی ہو،

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ تم میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے

لِكَيْ تَحْلِفُوا قُلُوبُكُمْ لَا تَكْفُرْنَ، (نورۃ) وعدہ کیا کہ اُن کو زمین کا مالک بنا دیگا،

آخرت کی مغفرت اور دوزی کا وعدہ بھی انھیں سے تھا،

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْكُمْ اللہ نے اُن میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام

مَعْمُورَةً وَاجْرًا عَظِيمًا، (فتح - ۴) کئے بخشائیں اور بڑی دوزی کا وعدہ کیا،

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکو کاری کو جگہ دی گئی ہے

مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس وعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا،

بَلْ مِنْ أَمْرٍ رَبِّهِمْ بِهِ وَهُمْ مُّخْبِرُونَ فَلَمَّا آخِزُوا کیونکہ انہیں جس نے اپنے کو اللہ کے تابع کیا، اور وہ نیکو کار

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا يَحْزَنُونَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، تو اس کی مزدوری اُن کے پروردگار کے پاس جو راز

ہے اُن کو اور نہ غم،

(ذبحہ - ۱۳)

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے، کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں، بلکہ ایمان کیساتھ عملِ صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے بیشتر مذاہب میں افراط و تفرط نمایاں تھی، عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں جو صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے، اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے، اور کین صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا وسیع ذمہ (ایمان) اور جہانی (عملِ صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز تو ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اسکو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عملِ صالح ہے، اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انھیں دو باتوں پر ہے، کوئی مریض صرف کسی اصولِ طبی کو صحیح مانتے سے بیماریوں سے نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے، اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں، جب تک اُن اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے،

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ
خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اللَّغْوِ مُعَصِّمُونَ
وَالَّذِينَ هُمْ لِلْزَكَاةِ فَاعِلُونَ، وَالَّذِينَ
هُمْ لِقَاءِ رَبِّهِمْ يَحْفَظُونَ..... وَالَّذِينَ هُمْ
لِلْمُنَافِقِينَ كَالْعَصِیِّ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ
يَحْفَظُونَ، أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ، (مومنہ ۱)

وہ ایمان والے خدا کو پہنچنے، جو نمازیں عجزی کرتے ہیں،
جو لغو باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں
جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں.....
اور
جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی
نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں،

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی ظلل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، ایمان کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک اُس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری جھوک کا قطعی علاج ہو، ہماری جھوک وضع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے ہم کو تہجد و جہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چاکر کر اپنے پیٹ میں لٹکانا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لجاتی ہیں،

لہذا دونوں کا
۲۳۴

ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کیساتھ ہم اپنی ناکون کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں،
یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے، اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول
کے لیے بیکار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرنا چاہو اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو
سرے سے نہیں مانتا، کیونکہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر جانے اور نیک عمل بنانے کی امید ہو سکتی ہے، اور
دوسرے کے لئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل
و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا،

اعمالِ صالحہ کی تین اعلیٰ صراح کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں تاہم انکی
عملی تفصیلات حسب ذیل ہیں، عبادات، اخلاق، معاملات،

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی
ہو، اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش فہمی کے ساتھ کئے جائیں تو وہ عبادت میں داخل ہیں، مگر فقہاء نے اصطلاحاً
تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہیں جنکی تفصیل یوں کیجا سکتی ہے کہ اولاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ
جسکا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جسکا تعلق بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں
ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے، اور دوسری وہ جن کا فانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ
ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے،

اعمالِ صالحہ کی تین تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبیؐ کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع ہے،

عبادات

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْتَبِعُوا صُلُوبَكُمْ

عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جنکو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے، لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی، اسکا اہل جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادت کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل میں ہم بیانات کی تشریح، اور اہل تعلیمات کی تفصیل لگائی،

اہل عرب بھان آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بیخبر تھے، وہ ان عبادت کے مفہوم معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے، عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے علم اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے، اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے، اور عبادت میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنان بیا بانوں اور پہاڑوں میں انھوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنائی تھیں، اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے بہت کچھ راجد و نقصانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تحقیر ایک مذہب متبتل کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس کہتا ہے،

منارة مسبل واهب متبتل، دنیا سے الگ تنگ زندگی بسر کرنے والے مذہب کا پرچم،

یہودی جاو، ٹوٹا اور عیسا کے توہات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا، غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سہر جھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدین کی تصویریں، مجسموں، یادگاروں، اؤ مقبروں کو پوجتے تھے، انھوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور حجم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے، اور ان کا نام انھوں نے دینداری رکھا تھا، سورہ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق گناہی لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین میں کی اورستی کرنا، اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے شریع دین میں کی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں، اسی لئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا،

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي
 ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ مِمَّنْ هُمْ أَشَدُّ
 وَكَيْفَ مِمَّنْ هُمْ أَشَدُّ فَسَبِّحُوا ثَمَّةَ تَقِيْنَا عَلَى آثَارِهِمْ بَرَكَةً
 وَتَسْلِيمًا إِنَّ مَرْيَمَ وَأُسَيْنَا إِذَا تُدْعَى
 إِلَيْهِنَّ فَيَلْبِسْنَ ثِيَابَهُنَّ وَجَعَلْنَا فِي
 ذُرِّيَّتِنِ الْأَنْبِيَاءَ وَطَرَفَهُنَّ الطَّوَّافِينَ
 أَفَبَدَّلْتُمْ أَنَّكِ الْغُلَامَ الْكَافِرَ
 الَّذِي لَا يَرْجُو قِيَامَ يَوْمِ يُنْفَخُ الْأَشْجَارُ
 فَتَرَى الْكَافِرَ يَخْوَفُ الْكَافِرِينَ

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا، اور ان کی نسل میں نبوت
 اور کتاب رکھی، تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں، اور اکثر نافرمان
 ہیں پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے
 مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، اور ان کو عملِ غایت فرمائی اور جنہوں نے
 عیسیٰ کی پیروی کی ان کے دل میں نرمی اور حمدِ بنائی، اور ایک نیا
 انھوں نے نئی چیز نکالی، جو ہم نے ان پر نہیں رکھی تھی،
 لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انھوں نے اس نسبت

الَّذِينَ آمَنُوا وَآمَنُوا بِآجُرِهِمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ
فَسَقُونِ (احدید-۴)

تھے انکو بننے کی ضروری دی، اور انہیں ہرکے ہرکے نازان بن
ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرکب جو ہے اسی لئے قرآن نے انکو بار بار کہا،
لَا تَعْلَوْا فِي دِينِكُمْ (نساء ۵۹-۶۰) اپنے دین میں غلو نہ کرو،

اُن کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا، وہ ابن اللہ بننے
لگے، اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے، بلکہ اُن کو قتل کرتے تھے،
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ (بقرہ ۹۱) ساتھ ہی وہ خدا سے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں
کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار
تذکرہ ہے، اور قرآن میں اُن کے متعلق ہے،

وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ، (مائتہ-۹)

اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا،

انحضرت صلعم نے عیسائیوں کو تبلیغ کی،

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ

مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأَمَّا هُودٌ فَبَدَّلَ كِتَابَ

يَا حُكَّانَ الطَّغَاةِ، أَنْظُرْ كَيْفَ تُبَيِّنُ لَهُمْ

الْآيَاتِ لَمْ أَنْظُرْ فِي بُيُوتِهِمْ قُلْ الْغَيْبُ

مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَكِلُ لَكُمْ وَصْرًا وَلَا

نَفْعًا وَلَا نُزْرًا هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، قُلْ يَا

اَكْثِبُ لَا تَعْلَوْا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا

تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ

وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ، قُلْ يَا

اَكْثِبُ لَا تَعْلَوْا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا

تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور میں اس سے پہلے

پیغمبر گذر چکے اور میں کی ان ولی تھی، دونوں (انسان)

تھے، انکا نام کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں)

کے لئے اس طرح کھول کر دلیل بیان کرتے ہیں پھر

بھی دیکھو وہ کہہ رہے ہیں، ان سے کہہ کر کیا

تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے تم

میں نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی بخشنے والا اور جاننے

والا ہے، جو نفس نقصان پہنچا سکتا ہے، اسے کہنا چاہیے

وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ، قُلْ يَا

اَكْثِبُ لَا تَعْلَوْا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا

تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ

اَصْلُو الْكُتُبِ اَوْ حَسَنُوْا عَنْ سَوَاعِدِ السَّبِيْلِ ، اپنے دین میں ناقص زیادتی نہ کرو، اور لوگوں کے خیال پر نہ چلو

(مسئدہ - ۱۰) جو بہانے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستے سے ہٹا کر

اُن کی حالت یہ تھی،

اَتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُفَہَاہُمْ اَرْبَابًا مِّمَّنْ خدا کو چھوڑ کر اپنے مالوں اور درویشوں کو خدا بنا

دُونِ اللّٰہِ ، (توبہ - ۵) لیا تھا،

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستشگاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں ان میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویروں، اور مجسمے نصب تھے، عبادت گزاران کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سر بہ سجود رہتے تھے، صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے انسا میں ان مبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، ان میں سے شایع بعض بی بیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی، چنانچہ انھیں صلیم کے مرض الموت میں بعض ازواجِ مطہرات نے آپؑ اسکا تذکرہ کیا، اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حق خوبی کو بیان کیا، انھیں صلیم نے فرمایا خدا میدود نصاریٰ پر نصرت بھیجے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا، تم ایسا نہ کرنا، ان میں جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنالیتے تھے، اور اس میں سکی تصویروں کھڑی کر دیتے تھے،

ایڈورڈ گوبن نے تاریخ ترقی و زوالِ روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ تمام تحدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں، خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، سینٹ پالؑ، اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے، اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم سچی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درود و پارسے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات موسیقیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگون نظر آتے ہیں،

سلحہ صحیح مسلم کتاب المساجد،

روم دہلی کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اُس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی،

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے، مگر انکی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بخیر تھے، لات، عوامی، ہیکل، اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے، اُن پر جانور قربانی کرتے، اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، سال کے مختلف اوقات میں مختلف بتخانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے، اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے، خانہ کعبہ یعنی خلیلؑ بہت شکر کا معبد میں موساؑ ساتھ بتوں کا مرکز تھا، اور اُن کی ناز پر تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سٹی اور تالی بچا کر بتوں کو خوش اور رضی رکھیں، قریش کا مودعہ زید بن عمرو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، وہ لٹا کر تھا کہ اسے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں اگر جانتا تو اُسی طرح عبادت کرتا۔

ایک صحابی شاعر عاتق بن اذعہ حیر کے سفر میں یہ ترانہ گارہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رہے تھے،

وَاللّٰهُ لَوْ كَرِهَ اَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ ناز پڑتے۔

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح

طریقوں سے آشنا کیا،

عرب کے باہر بھی کہیں خدا سے واحد کی پرستش نہ تھی، بہت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجتھے اور

ستاروں کے سیکل پوجتے تھے، روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ

حضرت مریمؑ اور سینکڑوں دیوں اور شہیدوں کی مورتیاں، اور پڑیاں، اور انکی مصنوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں زبردستی

کی ملکیت میں آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لیکر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں

سے سیرقہ میں ہشام ذکر زید بن عمرو، صحیح مسلم باب غیر مشرک پہلا لفظ مختلف روا بتوں میں مختلف ہی۔

سادھوں اور اس کی علی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین کے کنشوس اپنے باپ دادوں کی مورتوں کے آگے
خم تھے، خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، لنگامائی، اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے ہماہی سبع ستارہ کی پرستش
کی تاریکی میں مبتلا تھے، باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی، غرض میں
اس وقت جب تمام دنیا خدا سے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی، ایک
بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ، (بقراءۃ)

اور تم سے پہلے کو پیدا کیا،

سابق کتب الہی کے امانت داروں کو آواز دی گئی،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ نَعَاكُمْ إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ
بَيْنُنَا وَبَيْنَكُمْ لَئِنْ لَمْ تَعْبُدُوا اللَّهَ،
اے کتاب والو! آؤ تم ہم اس بات پر علامت ہو جاؤ
جہاں تم عقیدہ متفق ہیں کہ ہم خدا سے برحق کے سوا
کسی اور کی پرستش نہ کریں، (ال عمران: ۷)

مگر یہ آواز ریگستان کے سرے چند حق پرستوں نے سنی، اور پکار اٹھے،

رَبَّنَا إِنَّا أَسْمَعُ مَا نَدَايَا ثِيَابِنَا دَعَىٰ لِلْإِيمَانِ
إِنْ آمَنُوا بِرَبِّكُمْ فَامْنُنَا رَبَّنَا فَاعْفُ عَنَّا
دُعُونَا، (ال عمران: ۲۰)

ہمارے گناہ معاف کرو،

ان واقعات کو سامنے رکھ کر انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو ہر سر کے امتحان کا دھن آہنگی زبان
عبودیت ترجمان سے بارگاہ الہی میں لگتی تھی،

”خداوند! تیرے پوجنے والوں کی بیٹھی بھر جاعت آج تیرے لئے رٹنے پر آمادہ ہے، خداوند! ”

آج اگر یہ سب گئی تو چھترین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی۔“

لے صبح سید جان
نہ مری، ہونہ بد

خدا نے اپنے نبی کی دعائی اور قبول فرمائی، کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا، اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا،

صرف ایک خدا کی عبادت، مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوتِ محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے دنیا کے کچھ ن
سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا، باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش قطعاً محکوم و ناجائز ہے، اور صرف اس ایک خدا کے سامنے، خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دین، اور صاف اعلان کر دیا کہ

إِنِّ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ إِلاَّ أَنَا
الْمُحْمَدَانِ عَبْدٌ (موسیٰ - ۶)
ہی بیکر آنے والی ہے،

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں، نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر، اور نہ زمین کے نیچے، کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے
سجدہ، اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے، اور نہ اس کی
پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہو، اور نہ اس کی تدرمانی جاسکتی ہو، اور نہ اُس سے دعا مانگی جاسکتی ہو، ہر عبادت
صرف اسی کے لئے، اور ہر پرستش صرف اُسی کی خاطر ہے،

إِنِّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ، (الفجر - ۲۰)
موت سب اُسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے،

گناہ کو تو تون، دیوتاؤں، ستاروں، اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا، اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا
گیا کہ خدا نے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں، لیکن جب ان پر اس سمجھانے بھانسنے کا کوئی اثر نہ ہوا، تو اسلام کے پیغمبر کو
اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا،

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا إِنِّي لَأَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ
وَلَا أَشْرَعُ عَبْدٌ وَإِنِّي لَأَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ
عَالِمٌ مَا تَعْبُدُونَ شُرَكَاءَ اللَّهِ
اے کافرو! میں کو تم پرستے ہوں اس کو میں نہیں پوجتا، اور
نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو، جس کو میں پوجتا ہوں اور
زمین اس کو پوجنے والا ہوں، جبکہ تم نے پوجا اور نہ تم

اَعْبُدْ، لَكَ كَرِهَ دِيْنُكَ وَلِي دِيْنٍ، اس کو پوجنے والے جو جس کو مین پوجتا ہوں، تمہارے

(کفرہ - ۱) لئے تمہارا دین ہو، اور میرے لئے میرا دین ہے،

خارجی رسوم کا وجود نہیں | خدا کی عبادت اور پریش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ سوج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے طلبے، نہ سامنے آگ کا لاؤ جلانے کی ضرورت، نہ دیوتاؤں، دیویوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت، نہ سامنے موم بتوں کے روشن کرنے کا حکم، نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت، نہ نوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاوہ ہے، اس کے لئے صرف ایک پاک شتر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہو،

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں | اسلام میں عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان، اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانی کی حاجت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پڑوہت ہیں، نہ بچاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں، نہ حاخام ہیں، نہ حضرت ہارون کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لئے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے، اور نہ پاریسون کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو، میں جواب دوں گا:

اَدْعُوْنِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن - ۶) تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا،

اسے جیسا کہ ہندوؤں میں ہے، اسے جیسا کہ پاریسون میں ہے، اسے جیسا کہ ہندوؤں، عام بت پرستوں اور رومن کیسٹوک میں ہے، اسے جیسا کہ رومن کیسٹوک میں ہے، اسے جیسا کہ یسائیوں میں ہے، اسے جیسا کہ یسائیوں کے ہاں ہے، پاریسون میں سپید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے،

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں | اگر خدا ہونے اپنی عبادتوں کو دلکش و مغرب، مؤثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا کہ مین ناقوس اور قرآن کی پر عجب آوازیں تھیں کہ مین ساز و ترنم اور نغمہ بریط کی دلکش صدائیں تھیں کہ مین بس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دین محمدی کی ساوگی نے ان مین سے ہر ایک سے احتراز کیا، اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا رونا و نیاز اپنی اصلی اور فطری ساوگی کیساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے،

مکان کی قید نہیں | ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چار دیواری میں محدود کیا ہے، بُت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہ مین دعائیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ مین نہ کسی درو دیوار کی ضرورت نہ محراب منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم مسجد و صومعہ اور مسجد و کینہہ سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ، بلکہ پہاڑ کے کائنات کا ہر حصہ، ہر مکان مسجد اور عبادت خانہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں، ہر جملہ ان کے ایک یہ ہے،

و جعلت لی الارض مسجدًا، اور میرے لئے تمام روئے زمین مسجد گاہ بنا دی گئی،

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشت چمن مین ہو کہ ہنگامہ کا زار مین، خشکی مین ہو کہ تری مین، ہوا مین ہو کہ زمین پر، ہوا مین ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجالا سکتے ہو، یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد مین جو مین سامنے بُت اور مجسمہ نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فرض عبادت ادا کر سکتے ہو،

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب مین ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک ماحد رخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ ان مین وحدت کی شان نمایاں ہو مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی، اور اس کے لئے اسلام مین مسجدِ براہمی کی تخصیص لگائی ہے کہ وہ دنیا مین خدا کے واحد کی

لئے بخاری کتاب الصلاۃ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجدًا، و طحاوی، مشکوٰۃ، بخاری کتاب الصلاۃ باب الصلاۃ فی البیت،

پریش کا پہلا مقام ہے لیکن اسکی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے حدود سے پاک ہے، وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں، دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اسکی طرف رخ کرتے ہیں مغرب کی بھی مشرق کی بھی شمال سے بھی اور جنوب کی بھی کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں ایک وقت ہر جہت سے اسکی طرف رخ کیا جاتا ہے، اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی تہ نہ لگ سکے، تو جہر بھی رخ کرو، ادھر ہی خدا ہے، چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام فاضل نمازوں کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں، جدھر سواری کا رخ ہو اُدھر ہی سجدہ کیا جاسکتا ہو، لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کیا جاسکتی ہے، اگر خدا نخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کی طرف رخ کرنا کافی ہو، کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو،

انسانی قربانی کی ممانعت بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر یا دریا میں ڈوب کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے، اسلام نے اس عبادت کو قطعی استیصال کر دیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی چٹائی کی حمایت میں، یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروا نہ کی جائے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے، یا دریا میں ڈوب کر مر جائے، یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے، اپنے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اس کو جہنم میں ہی چیز سے سزا دی جائے گی۔

جوانی قربانی میں اصلاح کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا، عرب میں اسکا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے، کبھی بیکرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر ہانڈو دیتے تھے، اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے مسجد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ

لے صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر فاد۔

دیتے تھے یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اُس کا گوشت جلا دیتے تھے، اور اُس کے شعلے وہ جو رسوم ادا کرتے تھے اُن کی تفصیل صفوں میں بھی نہیں سہا سکتی، اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے، بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اُس کا گوشت چیل اور کڑوں کو کھلا دیتے تھے پیغام محمدی نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا، اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دل کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا،

لَنْ يَنَالَهُ اللَّهُ لَوْ مَجَّاهُ وَلَا دِمَاجُهَا وَلَكِنَّ
يَنَالُهُ السَّقَوِيُّ مِنْكُمْ ۝ (ج- ۵)

بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچی ہو،

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی اور اہل استطاعت کیلئے جو موقع حج پر نہ گئے ہوں مقام حج کی یاد کے لیے قربانی سنوں لگینی ہو، تاکہ اُس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا، اور خدا نے اُس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اُس کی پھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی، اور اُس کے پیروں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی،

اسی کے ساتھ پیغام محمدی نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا روح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ لینا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصد دو ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اُس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور اُن کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا، اور دوسرا یہ کہ اُن کا گوشت غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے، چنانچہ فرمایا،

وَلْيَكُنْ أَصْنُو جَعَلْنَا مِنْكُمْ آلِ إِبْرَاهِيمَ
اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَرَىٰ قَوْمًا بَصِيرَتِهِ الْأَنْعَامُ وَلَقَدْ
إِلَهُ وَاحِدٌ فَذَكَرْهُمْ لِقَابِ الْمُحْسِنِينَ،

یعنی ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان جانوروں پر
خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے اُن کو روزی کی، تو تمہارا
خدا ایک خدا ہے، اُسی کے آگے سر جھکاؤ، اور عاجزی کر

واسے بندوں کو خوشخبری سنا دے،

(ج- ۵)

لے اجازت

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِيزِينَ سَعَاءٍ لِلَّهِ
لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ تَذَكُّرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا
صَوَافٍ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا
مِنْهَا وَأَطِيعُوا أَمْرَ اللَّهِ وَالْعَزَّوَجَلَّ إِلَهُكُمْ
سَعَاءٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

اور قربانی کے جانوروں کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے تاکہ
لے ان میں بہت فائدہ ہیں، ان کو قطار میں کھرا کر کے
تم ان پر خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے پھل جھکیں،
(یعنی ذبح جھکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی
قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو، اسی طرح

ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا کہ خدا کا شکر ادا کرو (ج-۱۵)

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں
فیصل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے، وَمَا أُوتِيَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ، عرب میں دستور تھا کہ خاص وجہ کے مہینہ میں
قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح
کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو، اور (غریبوں کو) کھلاؤ، غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں، صرف خون بہانے کے لئے خون
بہانا قربانی کی حقیقت نہیں، اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں کی دہیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہو۔

مشرک نہ قربانیوں کی اسی لئے وہ تمام مشرک یہ تشریاتیان جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں، عرب
کی مانعت میں جانوروں کے قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو
پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے، اور اس کی کھال کو دست پر لگا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو ذبح
کرتے تھے، جب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جس کا نام غیر تھا اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار
دیا، اور جب کی تخصیص ہل کر دی۔

قال لا فروع ولا حنیفۃ۔ اپنے فرمایا کہ فروع اور غیرہ جائز نہیں ہو۔

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے، اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں

استعمال نہیں کر سکتا تھا چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی،

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ مِجْرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا

وَصِيْلَةٌ وَّلَا حَاجَ، (مائدہ-۱۴) نبایا،

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسمِ ماتم کی جو اصلاحیں کیں، اُن کے سلسلہ میں اس کو بھی نامائز قرار دیا، فرمایا۔

اسلام میں قبر کے یاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مثلاً ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا، پھر جس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا، اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جسکے اونٹ ختم ہو جاتے، یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جان مال کے اتلاف کو روک دیا۔

تجربہ مرکب لذت و دایمانست، عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے، اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور اس کی تعریف شاد مہمات میں۔

تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائیگا، اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئیگی، چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا کہ کوئی گوشت نہ کھا کر صمد کر لیتا، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سر پابا رہ نہ رہتا، اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ٹک بھجھتا تھا، کوئی پتہ کی سروی میں اپنے بدن کو بٹھا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، اور سونے اور بیٹھے سے قطعا پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سونہ کھ جائے، کوئی عمر بھر تار ایک تہ خازن اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی حجر اور ترک نیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا، لیکن نبوت محمدی نے یہ آزمائش کا کیا، کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری عظیمین خدا کی خوشنودی

الحاج محمد باقر
النجاشي
الذي كان من علماء
الشيعة في
القرن الثاني عشر
هـ

کا باعث ہوا اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہو، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی عزت بڑھتی ہو، نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہو، خدا کا دین اتنا ہی ہے جو زندہ کی استطاعت کے اندر ہوا، اسے کہا:

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا، خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (کم)

(ترجمہ - اخذ) نہیں دیتا،

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جسکو بعضوں کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکے ہیں، اسلام نے اس میں متدبر آسانیاں پیدا کر کے کہا،

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۱۸۵) خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں،

جج بھی سب لوگوں پر مشعل تھا، تو ساتھ ہی فرما دیا،

مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (ال عمران - ۱۰) جسکو ذرا ذراہ اور چلنے کی استطاعت ہو، اسی پر حج فرض ہے

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (۱۰) تمہارے لئے دین میں اس نے خدا نے کئی نہیں کی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

إِنَّ هَذَا الدِّينَ يُسْرٌ وَلَئِنْ يَشَاءَ الدِّينَ أَحَدًا إِلَّا غَلَبَهُ . یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی میں متا کر گچھا، تو دین اسکو مغلوب کر دیگا،

اور فرمایا،

إِنَّمَا أُنَافَعْتُ بِالْعَمَلِ السَّامِعَةِ وَالسَّامِعَةِ الْحَنِيفَةِ الْبَيْضَاءِ میں تو سہل اور آسان روشن حنفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں،

مذہب میں رہبانیت اور جگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خواہ وہ کتنی ہی خوش فہمی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا، اور کہا،

لے جمع القواعد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری سنن نسائی سنن ابن ماجہ جلد ۵ صفحہ ۲۶۵،

وَرَبُّهَا نَبِيَّةٌ رَابِعَةٌ عُوْهَا مَا لَكُنَّهَا مَا عَلَيْكُمْ
 اِكْلًا اَبْعَاكُمْ رَضَوْنَ اِلَلَهُ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ
 رِعَايَتِهَا، (حدید - ۴)

اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت بنالی اور
 ہم نے اُن کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کلم
 نہیں دیا تھا، تو عیسایا اپنے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا،

ان لوگوں جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے
 خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ
 وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ، (اعراف - ۳۱)

پوچھ لیے بغیر کہ اس زیب و زینت اور رزق کی بھی چیزوں
 کو حرام کرنے اپنے بندوں کیلئے بنایا، کس نے حرام کیا،

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بی بیوں کی خوشنودی فرج کے لئے
 شہ نہ کھانے کی قسم کھائی تھی، اس پر عتاب آیا، خدا نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ
 تَبِيعِي مَوْصَلَاتِ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تو سے لئے حلال کیا، تو اس کو بھی
 بی بیوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہو،

رُحِيمٌ، (تحریم - ۱)

اور خدا بخشنے والا مہربان ہو،
 صحابیہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تہجد، ترک لذت، اور ریاضت
 شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس سے باز رکھا، اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لیکر نہیں آیا، جو امتہ میں
 مفلون اور اُن کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر تہجد
 رہنے اور شادی نہ کرنے کا ارادہ کر لیا، تو دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپ نے فرمایا: میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں
 یہ سکر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہتے،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ خبر کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھتے

اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اُسے عبداللہ رات تم پر تھا اسے جمع کا بھی حق ہے تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے، اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعون کو فرمائی، آپ کو اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب روزہ عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں، آپ نے اُن کو بلا کر پوچھا کہ کیوں عثمان تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے، عرض کی کہ خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ کی اس کے طریقہ کا طلبگار ہوں۔ فرمایا میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے بچھ بھی کرتا ہوں، اسے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل عیال کا بھی تہہ قرع ہے، تمہارے عمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تہہ قرع ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوتو بھی،

قبیلہ بابلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انھوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزہ رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو اُن کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ انکو پہچان نہ سکے، انھوں نے اپنا نام بتایا، تو فرمایا تم خوشرو تھے، تمہاری صورت کیوں ایسی ہو گئی، عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں تب فصل روزے رکھتا ہوں، فرمایا تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے، انھوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی، تو آپ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی، انھوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیئے، انھوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دے دی، ایک دفعہ چند صحابہ نے ازواج شہوات کی نسبت میں حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا صلعم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھوں نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلعم سے کیا نسبت ہے؟ آپ تو معلوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نازین پڑھتا ہوں، دوسرے صاحب نے کہا میں نماز پڑھتا ہوں،

سے صحیح بخاری کتاب الصوم ص ۱۷۰ ابوداؤد کتاب الصلاۃ باب ایوم من العید فی الصلاۃ، تلم ابوداؤد باب عموم الشہر الحرم،

روز سے رکھ کر گناہ سے صاحبِ لپٹا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر غرور ہو چکا، کبھی نوحہ نہ کروں گا، آنحضرت صلعم ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے، ان کو خطاب کر کے فرمایا: خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تم میں روزہ رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں ملے۔

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبطِ نفیس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادیں، انھوں نے آنحضرت صلعم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی، تو اپنے سخت پرہیزگار فرمائی حضرت عبداللہ بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہؓ کہتے ہیں اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ ان واقعات سے اندازہ ہو گا کہ آپؐ کس اہتمام میں بیعت کیساتھ کو گون کو عبادت کا صحیح منہم و مقصود تعلیم فرمایا، آپؐ نے کبھی کبھی بذاتِ خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہؓ بھی آپؐ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے آپؐ منع فرمایا، لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپؐ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں، اس لئے انھوں نے افطار نہ کیا، آپؐ نے دو دن روزہ رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا آپؐ نے افطار کر لیا، اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا، صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں، فرمایا تم میں سے کوئی میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے، اسی لئے اسلام میں عام امت کیلئے یہ روزے نہیں ہیں،

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپؐ کا گزر ہوا، دیکھا تو ایک گھبے میں ایک رسی ٹنک رہی ہو، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینبہؓ باندھی ہو، رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی خشک جاتی ہیں تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں، یہ سنکر آپؐ فرمایا: یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اُسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشا باقی رہے، جب کوئی خشک جائے تو چھوڑ جائے۔

لے صحیح بخاری کتاب النکاح صفحہ ۱۱۱ و کتاب النکاح صفحہ ۱۱۲ و کتاب الصوم صفحہ ۱۱۳ و کتاب النکاح صفحہ ۱۱۴ و کتاب النکاح صفحہ ۱۱۵

ایک فہم ایک عورت سامنے سے گذری حضرت عائشہؓ نے کہا یہ غولاب ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھرین
سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہو، فرمایا کہ یہ رات بھرین سوتی، لوگو! اسی قدر کوشش طاقت ہو
جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نازون میں مشغول رہتے تھے، ان کو غلط تعبیر کیا

اکلفوا من لھل ما نطیقون فان الله لا استے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو، کیونکہ جب تک
بمجد حتی تملوا فان احب العمل الى الله تم نہ اکتا جاؤ، خدا نہیں اکتا، خدا کے نزدیک سب سے
ادومہ وان قلے پسندیدہ وہی کام جو سب کو تمہارے کر سکا اور چاہو پتھر بھی ہو،

جج رہنمائی کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں نہ
سے کچھ نہ بولیں گے، یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے، اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے، یا اس سفر میں
کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے، بعض لوگ اپنی گہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک میں نیل ڈال کر رکھوا
کرتے تھے، اور اس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ خود کی تکلیف خدا کی خوشنودی
کا باعث نہیں، حضرت عقیقہ بن عامر کی بہن نے یہ نذرمانی تھی، کہ وہ پیدل حج کریں گے، عقیقہ نے اگر حضرت صلعم سے فتویٰ
پوچھا، آپ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں، اُن سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں، اسی طرح
آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپ نے اُس کو سوار ہونے کا حکم
دیا، اُس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپ نے فرمایا میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے، لیکن تم اس پر سوار ہو
ایک فہم حج کے سفر میں آپ نے ایک بڑے کو دیکھا جو خود چل نہیں سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر
چلا رہے تھے، آپ نے دریافت فرمایا، تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے، فرمایا، خدا کو اس کی حاجت نہیں،
کہ یہ اپنی جان کو اس طرح خدا سے دے گا، اُس کو سوار کر دو۔

القیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) عن انس بن مالک، باب الاقتصاد فی الاعمال، لیس فی الفوائد، ج ۱، ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلپاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے، آپ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، اور اسکی یہ کیا حالت ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرئیل ہے، اس نے مذمانی جو کہ وہ کھڑا بیٹھا، بیٹھے گئے اور نہ سایہ میں آرام کریگا، اور نہ بات کریگا، اور برابر روزے رکھیکا، آپ نے فرمایا کہ اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے، اور اپنا روزہ پورا کرے۔

جج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اسکی نیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے آپ نے جا کر نیل کاٹ دی، اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اسکو طواف کرو۔

اسی قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھا کر آپ نے فرمایا،

لا تشددوا علی انفسکم فانما هلاك من
کان قبلكم بشتد شدید هم علی انفسهم
وسجدوا بقایا همد فی الصلوع والدائیکل
اور دیون میں تم کو ملین گی،

خاتم الانبیاء صلعم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، آپ نے فرمایا،

(احمد رضا علی الاصلاح، (ابوداؤد) اسلام میں رہبانیت نہیں،

عزالت فیہی قطع ملائق اکثر ما ہینے وینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ، یا جنگل میں بیٹھ جا
عبادت نہیں، اور تمام دنیا سے کنہ کشی اختیار کر لے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا،

عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے پہل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ
شخص جو اپنے تمام ہمنمون سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت انہائے جس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے

لے جمع بخاری، ابوداؤد، وابن حارود کتاب الایمان والندۃ سلفہ صحیح بخاری ایمان و نذیر، سلفہ جمع الفوائد بحوالہ مہم کبیر واسطی لاطربی
وابوداؤد صفحہ ۲۰ باب الاقصاد فی الاعمال،

اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں، اسلام کا صحیح نخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علاقے کے جھوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہو اس کو بخوبی ادا کرے جو شخص ان تعلقات و علاقے اور حقوق و فرائض کے جھوم سے گھر اگر کسی گوشہ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامزد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیروں کو جو افر و سپاہی دیکھنا چاہتا ہے جو ان سب جھیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں، بلکہ ادا سے فرض ہے، ترک عمل نہیں، بلکہ عمل کرنا نہیں، بلکہ کرنا ہے۔

ابھی تم اور پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اُن صحابہ کو جو اہل خیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے فرمایا: اے فلاں! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہو، تمہارے ہمارے بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، اس سے ظاہر ہو کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجالانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گدڑ ایک ایسے مقام پر ہوا، جہاں موقع سے ایک غارتھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، اس پاس کچھ جگہ کی بوٹیاں بھی تھیں، ان کو اپنی عورت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ بابرکت میں اگر عرض کی، یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترکِ دنیا کروں، آپ نے فرمایا: میں یہوویت اور عیسائیت لیکر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں۔

اسلام سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادتِ الہی میں مصروف رہتے تھے، لیکن جبے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا، اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا، شبِ روزِ بین رات کی چند ساعتیں اور سالِ مین رمضان کے چند اخیر دن، گوشہِ عزلت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے تھے، اور تمام دن پوری جہانت کیساتھ مکرو خالق کی عبادت، اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے، اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہ کا طریقہ عمل تھا، اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادہ عبادت تھی،

۱۔ منہاج بن ضیل جلد ۲ صفحہ ۲۶۶۔ ۲۔ اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موعظوں پر ہے، ایک ان

اسلام میں عبادت کا | اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں، جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں خدا سے عز و جلال کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا، اور اس کے احکام کو بجالانا جو، **یٰ لَیْسَ لَکَ قُرْآنٌ بِکَافٍ مِّنْ عِبَادَتِکَ مَا تَعْبُدُ** اور بالحد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَعِیْزُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَّئِلُوْنَ
جو میری عبادت سے غور کرتے ہیں، وہ ہستمن
جہنم کا آخری، (مومن - ۶)

بائیں گے،

مفہوم ۲: کیلئے جس میں فطرہ بڑی ہو جس کی شریعت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ربائی سے بچنے کی تلقین کی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے پیش منہ کو کون ہے؟ ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے، دوسرے وہ جو کسی گھائی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو شر سے محفوظ رکھتے ہوئے اس قبیلہ پر نبی ہوئے انسانوں کی دوقیم کر دین، ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملے ہوئے ہو، تو ان پر یہ فرض ہو کہ وہ صحیح اور مجسم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دین، یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے، ورنہ ان کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طعاع و مآزوری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ جو ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہو کہ وہ اپنے کو جمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں، تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگوں کے آزار سے محفوظ رہیں،

دوسرا موقع جہنم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت نشینی کی اجازت دی ہے، وہ ہے حبیب جمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار طبع گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گونہ گریں جو جائے، چنانچہ اپنے صحابہ سے فرمایا کہ ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جو ایک بکروہ بادش کی نگہوں اور پادشاهوں کی نگاہوں کو تلاش کرے تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو نقصان نہ پہنچائے، صحیح بخاری میں باب العزلة (استحباب من خلایا السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی حقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا، جماعت اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے، اور دوسرے موقع پر جبکہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہے اور کوئی فرد جو جائے خود نیک اور مسعد ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے،

۱۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلة (استحباب من خلایا السوء)

فرشتوں کے متعلق فرمایا،

وَمِنْ عِنْدِكَ لَا يَسْكُنُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ (انبیاء)

جو اس کے پاس ہیں وہ انکی عبادت سے غور نہیں کرتے

سہادت مند اور با ایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا،

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِهَا

میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جہکوں آیتوں کو

خَرَوْا سُجُودًا وَتَمَجَّدُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ

سمجھایا جائے تو وہ مجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے پروردگار

لَا يَسْكُنُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ (سجدا ۲۰)

کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور غور نہیں کرتے،

اس قسم کی اور تین بھی قرآن پاک میں ہیں جنہے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غور و استکبار باہم مقابل کے متضاد

معنی ہیں، اس بنا پر اگر غور و استکبار کے معنی خدا کے مقابل میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو کبھی کوئی چیز جاننا، اور خدا کے سامنے

اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے، تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے

سامنے اپنی گردن اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر جتنی بھی کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک دو کام ہے جس سے

مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی انسان بظاہر کیسی ہی اچھے سے اچھا

کام کرے، لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے

ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے، اور یہی چیز عبادت

اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ چاہا ہوا ہے،

وَيَسْجُدُ لِلَّذِي يُولِي مَالَهُ يَتَزَكَّى

دورخ سے وہ پرہیزگار بن جائیگا جیسا کہ چاہنا، دل کی پاکی

وَمَا لِاحِدٍ عِنْدَكَ مِنْ نِعْمَةٍ يُنْفِرُ إِلَّا

ماہل کرنے کو دیتا ہے، اس پر کسی کا احسان باقی نہیں

أَتَبَعَكَ وَجْهٌ رَئِيهٖ إِلَّا عَن طَعْنٍ

جس کا بدلہ اس کو دینا ہو، بلکہ صرف خدا سے برتری ذات

اس کا مقصود ہو، وہ خوش ہوگا،

(لیل - ۱)

وَمَا تَنْفَعُكَ إِلَّا أَتَبَعَكَ وَجْهَ اللَّهِ (بقرة)

صرف خدا کی ذات کی طلب کیلئے جو تم خرچ کرو،

إِنَّمَا أَنْطَلِقُكُمْ لِرُوحِهِ اللَّهِ، (انسان-۱) ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہیں،

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، (معاویہ-۱) بھٹکار ہوں نازل ہون پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں

سَاهُونَ، الَّذِينَ هُمْ يُؤَاوِنُ، (معاویہ-۱) اور جو دکھاوے کے لئے کام کرتے ہیں،

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مختصر لیکن بلند فقروں میں فرمادی ہو کہ

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، (صحیح بخاری مسلم) اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہو،

اسی کی تشریح اپنے اُن لوگوں سے کی جو اپنا گناہ چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے،

لِكُلِّ امْرَأَةٍ مَّا نَوَىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ بِشَيْءٍ مِّنْ ذَلِكَ فَهُوَ فِي شَيْءِ الْهَجْرَةِ، (صحیح بخاری مسلم) ہر شخص کو وہی دیکھ جس کی اُس نے نیت کی، اگر ہجرت سے

اِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَاجْرَاءُ عَلَى اللَّهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِيَاكُم مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ فِي شَيْءِ الْهَجْرَةِ، (صحیح بخاری مسلم) مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کا ثواب خدا

کانت ہجرتہ الی دنیا یصیبہا و امراءۃ دیکھا، اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہو یا کسی عورت کیلئے

یکیلہا ہجرتہ الی ما ہا جزا لیلہ، ہے، تو ایس کی ہجرت اُسی کی طرف ہے جس نیت

سے اُس نے ہجرت کی، (بخاری باب اول)

اس تشریح سے یہ ثابت ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز، دل کی نیت اور اخلاص ہے، اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو، عبادت ہو، اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں دے ڈالو، تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اُس کے حکم کی بجا آوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہو، تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو حقیقتِ دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی، اور دل کے اخلاص کی غرض و

غایت بنا دیا ہے، اور یہی عبادت سے اسلام کا اعلیٰ مقصود ہو،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، (آل عمران-۲)

اے لوگو! اپنے اُس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا، اور تم سے پہلے کوئی معبود نہ تھا، (آل عمران-۲)

اس آیت سے ظاہر ہو کہ عبادتِ مستکی غرضِ غایت محض حصولِ تقویٰ ہو،

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے، اپنے ایک ذمہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے: اور قرآن نے بھی تقویٰ ہی انقلب ہو۔
دونوں کا تقویٰ، لہذا اسی نکتہ کو کھولا ہے، اسی کیفیت کا پیداکرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جنہیں شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں، کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند اُن مخصوص اعمال کا نام ہو جنکو انسان خدا کے لیے کرتا ہے مثلاً نماز، دعا، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تنگ دائرہ کو بید وسیع کر دیا، اس تعلیم کے روست، ہر ایک وہ نیک کام جو خاس خدا کے لئے اور اسکی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو، اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہو، اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو یا کسی انسان یا حیران کے فائدہ کے لئے ہو، لیکن اُس کام کرنے سے اُس کام کے کرنے والے کا مقصد، نمائش، دکھاوا، حصولِ شہرت، یا دوسروں کو احسان مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی بہت، خوشنودی اور رضامندی ہو۔

اس تشریح کے روست وہ عظیم انسان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذہب نے قائم کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس کو فتنہ مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی، بلکہ دودست کی ہو جاتی ہے، دنیا کے وہ تمام کام جنکو دوسرے مذہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کے جائیں، لیکن انکی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو، بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں، دین کے کام ہیں، اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے، تم نے اچھے

بڑھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تہیہ حق ہے، کہ اُس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تہیہ حق ہے کہ اُس کو کچھ دیر سوئے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو، اور تمہارا مہمان کا بھی حق ہے کہ اُس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اسکی عبادت ہی، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اسکا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ
لے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں
روزی کی بین اُن کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اُن
کی عبادت کرتے ہو، (بقرة ۲۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہی، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا

فَاخْبِدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ، (ہود - ۱۰)

اسکی عبادت کرو اور اُس پر بھروسہ رکھو،

اسی طرح مشکلات میں صبر استقامت بھی عبادت ہی، فرمایا

فَاخْبِدْهُ وَاصْطَبِرْ، (مید - ۲)

اسکی عبادت کرو اور صبر کرو،

کسی شکستہ دل سے اسکی تسکین و تسفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہی، ارشاد ہی،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ

اچھی بات کہنا اور معاف کرنا، اس خیرات سے بہتر ہے،

تَتَّبِعُهُمْ سَاءَ أَذًى (بقرة - ۲۷۱)

جس کے پیچھے تانا ہو،

اس آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہو،

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ، (احادیث کتاب الادب)

ہر نیکی کا کام خیرات ہی،

تَبَلَّغْتُ فِي رَجْعَةِ اخِيرَتِ صَدَقَةٍ،

تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر سسکانا بھی خیرات ہی،

وإِطَاعَةُ الْأَمْرِ عَنِ الطَّوْلِ صَدَقَ، راستہ کے کسی تکلیف وہ چیز کا ہونا بھی خیرات ہو،

غریب اور بیوہ کی ہر وہی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے فرمایا،

السَّامِعُ عَلَى الْأَمْرِ مِلَّةُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجَاهِدِ بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا قرب خدا

فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَكَالَّذِي يُصَوِّرُ الْمُتَهَامِرِينَ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے، اور اس کے برابر

بِقَوْلِهِ الدَّلِيلُ، (بخاری: ادب) ہر جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و ضما کے اسباب کو دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہو، جس کا درجہ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے ایک دن صحابہ سے فرمایا،

الْأَخْبَرُ كَمَا بِفَضْلِ مَنْ دَرَجَةِ الصَّيَامِ وَالصَّلَاةِ کیا میں تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر دہ کر

وَالصَّدَقَةِ، چیز بتاؤں،

صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے، فرمایا،

اصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہو،

حضرت سلمان فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابوذر سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اڑ میلہ کپڑے پہنے ہیں، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی، تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے، اس کے بعد جہان کے لئے کھانا آیا، تو ابوذرؓ نے کہا میں روزے سے ہوں، حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا

آخر انھوں نے اتفاق کیا، رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہا ہوں، پھر حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، اور کہا اب نماز پڑھو، چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا اے ابوذرؓ! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تو جس جس کا حق تم پر ہے، سب کو ادا کرو، حضرت ابوذرؓ نے حضرت صلعمؓ کی خدمت میں آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپ نے فرمایا،

لے سنن ابی داؤد و جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲

کہ مسلمان نے سچ کہا ہے

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے؟ فرمایا: خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ لوگوں نے پوچھا: کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہو؟ ارشاد ہوا جس کی قیمت نہ پانچ ہوا اور جو پانچ لاکھ کو زیادہ پسند نہ انھوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا: پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو اس کا کام کرو۔ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے، فرمایا تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔

ایک دفعہ اپنے صحابہؓ سے فرمایا: خدا اپنے بندوں سے کیسے کھانا کھاتا؟ تم نے نہ کھلایا، وہ عرض کریں گے: خداوند! تو نے کیسے کھانا کھانا؟ تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، فرمایا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے، اسے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا، وہ کہے گا کہ اسے پروردگار! میں بھٹک چکا ہوں، تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، وہ فرمایا: تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلانا تو اس کو میرے پاس پاتا، اسے ابن آدم! میں پیاس تھا، تو نے میری پیاس پر سی نہ کی، وہ کہے گا کہ اسے پروردگار! میں کیونکر تیری پیاس پر سی کروں، تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، فرمایا: تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ پیاس تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اس کے پاس پاتا۔

اس مختصر طریقہ ادا نے خدا نشی اور خدا نگاہی کے کتنے تو پروردگار کو دیکھا اور دیکھا، یا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعد جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دیدیں، اپنے انہیں بتایا کہ اسے سعد جو کچھ اس نیت سے خرچ کرے گا اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہو، اس کا ثواب ملے گا، یہاں تک

کہ جو فقہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اس کا بھی ثواب ہے۔ ابو سعید خدری سے ارشاد فرمایا مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔ غریب نادار صحابہ نے دربار رسالت میں ایک ان شکایت کی کہ یہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، اُن کے علاوہ وہ مالی جہت بھی بجالاتے ہیں، جو ہم نہیں بجالا سکتے۔ فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی جو جسکو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور بھلا کتنا بھی صدقہ ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے، وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے، لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے۔ فرمایا اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اُس کو گناہ نہ ہوتا، پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا؟

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ حسنِ عمل ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وضاحت پیدا کی ہے، اور کتنی خوب تو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائیگا کہ وحی محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقت انسان کی کی غرض ناسیت، عبادت الہی قرار دی ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْبُدَنِی ۚ

میں نے انسان کو اور جن کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ

(ذریعہ ۳۰) وہ میری عبادت کریں،

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہو چکے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اُس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں، جبکہ بچپن، بزرگی اور خیر انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی، یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا،

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے

لے ادب المفرد باب یوجزئی کل شیء، لے صیغہ بناری کتاب النکاحات، لے ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ،

سیکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، ان میں سے ہر ایک فرضیہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باقی ہے جس طرح کسی وسیع معنوں کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقرہ میں ادراک کر کے اس وسیع معنوں کے سر پر رکھ دیتے ہیں، اسی طرح یہ چاروں فرضیہ حقیقتیں انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں لگا لگ کر پیش کرتے ہیں اس لئے ان چار فقرہوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں،

۱۔ بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب

ہے، جس کا عنوان نماز ہے،

۲۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے، مختصر طور پر ذکر کر دیتے ہیں،

۳۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جہانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا، اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کی بجاہست اور آلودگی سے پاک رکھنا، جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حاصل ہوتی ہیں، روزہ ہے، یا یوں کہہ کر لیا روز قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے،

دنیا سے اسلام میں بہت اہمیت کی برادری، اور آخرت کی بہم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام، اور اس مرکز کی آبادی اور کس روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سر عنوان حج ہے،

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی چار گانہ کے تحت میں داخل ہیں، اسی لئے مختصر حکیم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا، پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے، اور دوسری چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں، انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے،

اس تقریر کا منہم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرضیہ عبادتیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں

لے صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان

بلکہ یہ مقصد ہے کہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور عزیمات کے ساتھ فرض ہیں، جو شخص صرف ان چاروں
فرائض کو جو عنوان باب میں ادا کرتا ہے، اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلوئی کرتا ہے، اسکی عبارت ناقص
اور اسکی اطاعت نامکمل ہو، اور اس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جسکا خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہو، مشکوک
ہے، یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں، ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ
کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دون کو پاک صاف کیوں نہیں کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت
کے باعث کیوں نہیں دیتا، اور قرآن کی طرح ہماری نمازیں، ملکوں کو فتح اور ہماری زکوٰۃ ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں
کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موجودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے،

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

لِيَسْخَرَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ، (نور۔ ۷) کہتے ہیں، یہ وعدہ کیا کہ وہ انکو زمین میں خلیفہ بنائیگا،

ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی دنیا کی توقع رکھنا حماقت ہو،

اسی طرح ان چاروں علی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے، صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل
ممکن ہے کہ دنیا سے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے، مگر آسمان کی بادشاہت میں اسکو کوئی حصہ نہیں ملے گا، اور
اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جانوں کی بادشاہیان رکھ دے، اور یہ اُسی وقت
ممکن ہو جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کیساتھ سمجھا جائے، جو اسلام کا منشا ہے، اور اسی وسعت کیساتھ اس کو ادا
کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہے،

المسکت بکبر کا فطری جواب ہے، قرآن نے جا بجا انسان کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مبینہ حق آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تھا را بھار مہمور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو، غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مجھو کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرض نیا کرے، اور اپنی دلی تنہاؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادتِ روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہو اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوشِ جنون کا علاج ممکن نہیں، وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس نڈسے فطرت کی تسبی کے لئے موجود ہیں، پھر آسانی مذہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں، اسلام میں اگرچہ صبح و شام اور روز میں مرسوم عیسائیوں میں دعا پارسیوں میں زمرنہ اور ہندوؤں میں گھن بن ہیں، اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے، اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ مذہب کے ان اصول میں سے جو جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں، قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر یا نبی نہیں آیا جس نے اپنی امت کو غارتگی میں نہ دی ہو، اور اس کی تاکید نہ کی ہو، خصوصاً ملتِ ابراہیمی میں اسکی حقیقت سب سے زیادہ نمایاں ہے، حضرت ابراہیم جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل کو کوہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اسکی عرض صحیح بتاتے ہیں کہ رَبَّنَا لَقَدْ جِئْنَاكَ بِالصَّلَوةِ (ابراہیم) اے ہمارے پروردگار، تاکہ وہ نماز گھڑی کریں، حضرت ابراہیم اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں، کہ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي، "اے میرے پروردگار! جھکو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز گھڑی کرنے کے

لئے قرآن کی تائید و تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے ہر ملا لفظ خدا کا نام لیتا تھا، چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے، حضرت ابراہیم نے بیتِ ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قرآن گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا، (پیدائش ۱۲-۴) حضرت اسمٰئیل نے خدا کا نام لیا، (پیدائش ۲۹-۲۵) حضرت داؤد نے خدا کا نام لیا، (زبور ۱۱-۱۴) اور اصطلاح قرآن میں بھی متعلیٰ ہوئی جو خود ذکرِ اسمِ ربِّہ تعالیٰ (الہی) اور اپنے رب کا نام لیا، اس نماز پر ہی اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں میں سفر و انیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کیلئے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عربی لفظ "صلوٰۃ" کے ہم معنی ہے، اسی لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اسکا ترجمہ نماز کیا ہے، (دستی ۱-۱۰)

بنا حضرت اسماعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہو، دکان یا مؤاخذ بالصلوٰۃ (دریغ) اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے، حضرت ثعلبہؓ کو ان کے ہم قوم طغہ دیتے ہیں، اَصْلُو تَلَفْ تَأْمُرُکَ اَنْ تَنْتَرُکَ مَا یَعْبُدُ اَبَاؤُنَا (ہود ۵۰) یہاں تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اُس کو چھوڑ دین، حضرت لوطؑ حضرت اسماعیلؑ حضرت یحییٰؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے، وَاَوْحٰیْنَا اِلَیْہِمْ فَعَلُوا الْخَیْرَاتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (انبیاء ۵) اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز پڑھنے کی وحی کی، حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں، یٰاٰیُّہَا اِبْرٰہِیْمُ الصَّلٰوۃَ (ذوقان ۲) اے میرے بیٹے نماز پڑھ کر، حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا، وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذٰلِکَ یَوْمِیْ (طہ ۱۰) اور میری یاد کے لئے نماز پڑھ کر، حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے، وَاَقِمُوا الصَّلٰوۃَ (یونس ۹) اور نماز پڑھ کر، بنی اسرائیل سے وعدہ تھا، اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمْ الصَّلٰوۃَ (مائیدہ ۳) میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز پڑھ کر، حضرت زکریاؑ کی نسبت ہو، وَہُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (زل عمران ۴۰) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں، وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃَ (صدہ ۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا، آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے،

مِنْ اَہْلِ الْکِتَابِ اُمَّتٌ یَّابِغُہٗ یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ
اَللّٰہِ اَنَّا الْبَیْلَ وَہُمْ یُحْجِذُوْنَ (زال عمران ۷۵) خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں، اور وہ مسجد کھد کرتے ہیں،

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں، مثلاً اپنے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو مرتبہ باندہ بویا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح (تنگے) نہ پڑھو (صفحہ ۱) تم یہودیوں کی طرح حرف اوپر سے نماز میں چادریں ڈال لو، بلکہ اس کو باندہ لیا کرو (صفحہ ۲) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھوٹو (صفحہ ۳) تم یہودیوں کے بغلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو (صفحہ ۴) میری امت میں اُوقت تک دین کا کچھ نہ کچھ نہ بیگا، جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نیکلے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کر گئے (صفحہ ۵) ان حوالوں سے کہ انہی اہل جہنم طبع عید آباد کے خلف ابواسبے یہ حدیث نقل کی ہیں، اور میں نے اس جگہ کے صرف صفحات لکھ دیے گئے ہیں،

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے،
عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے
واقف نہ تھے، چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گزر چکا ہے، کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں جب کو کیسے پوجوں یہ
کہہ کر تھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے، لیکن ایک دوا ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے چنانچہ
حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے
تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے بدھ رخ کر لیا، عرب کا ایک جاہلی شاعر
جران العود کہتا ہے،

وادرکن اعجاز من الليل بعد ما اقام الصلوة العابد المقتف

(اور ان سوار یوں نے رات کے پچھلے صفہ میں اس وقت کے بعد جب عبادت گزار یعنی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنیفی کے پیرو کھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے،
یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا، اور ان کی نماز صرف چند روم کا مجموعہ بتکرارہ ہی تھی، اور نماز سے زیادہ
ن قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ
انسان کی نماز میں بھی شروع کر دی تھیں، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سیکڑوں دیتوں اور شہیدوں
کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے،

دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کرتے تھے، ان فرض آپ کی بشت سے پہلے
ناز کی خالص اور صمدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل و صورت اس قدر منحہ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے
صحیفوں میں اس کی اصلی شکل نظر نہیں آتی، اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل

سہ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل ۱۷ صفحہ ۱۸۱ فی فضل ابی ذر ۱۲ مسند سان العربیہ حفظ ۱۲ مسند ویکو انسا یکتو پیدیا با بایجا
طبع یا زدم فطحاوت (ڈوشب) ۱۲

گو کہ کر دینا ہے مسلمان جب اپنی نماز کے لئے سُنَّی عَلَی الصَّلَاۃ (نماز کے لئے اُو) کا تازیانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ اُن کی خدا پرستی کی روح متنی مردود ہو چکی ہے جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اسکو نہی کھیل بنالیتے ہیں۔

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاۃِ اتَّخَذُوا ضَلٰوًا ۝۱۰ اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو نہی کھیل
فَلَعِبًا وَلَا ذَلٰلًا ۝۱۱ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ (مائدہ ۹) بنالیتے ہیں، یہ اسلئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں،

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گونا گویا صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر جو بے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ نتائج و طواف یا دوسرے موقوف پر وہ خدا سے دعا میں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے۔ موعداہ منوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے۔ دق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا،
وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا لَهْوًَا وَفَسَادًا ۝۱۲ اور ان کی نماز خانہ کسہ کے پاس سیٹی اور تالی بانا ہوا،

اگلے مفسرون نے اس آیت پاک کے دو مطلب لکھے ہیں، ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے، اُس میں سیٹی اور تالی بجا یا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے، اور گویا یہی اُن کی نماز تھی، پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھا، اور دوسرے معنی کے رو سے سرے سے اُن کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی،

ایک اور آیت میں ہے،

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُبْعَثُ عَبْدًا إِذَا أَصْلَىٰ (۱) کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکنا تو

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صبح حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو نیکی کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی منی اڑاتے اور کبھی دق کرتے، کبھی آپ کی گردن میں بھنڈا

لہذا ان جہاں
طبری اور
ابن جریر
مطہ العن

ڈال دیتے، اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لاکر ڈال دیتے تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بار نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو بیٹھتے اور تھمتھ لگاتے تھے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز میں تو اخلاص کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا مدینہ چھپکر نماز پڑھا کرتے تھے، اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سنائے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے، شکرین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن الحنفیہ میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا پاتے تو گھائیوں میں چھپکر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سید بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ شکرین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بد (دنیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو ہرا بھلا کیا، اور ان سے (لٹنے پر آمادہ ہو گئی،

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو خدا کے آگے سر سجدہ ہونے کی دعوت دی تو اس وقت یقیناً تم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بے گانہ تھے، ان کی نمازیں باہم اخلاص و اثر مسکون و دلجمعی، خشوع و خضوع، اور خوف و خشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کیساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے، اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی ان کے ہاں شرک کا منظر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا، اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے،

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا، **يَا أَيُّهَا الْمَدِينَةُ قَانِدِي نَارًا، وَسِرِّيَّاتَكَ فَكَلِمَةً** (متذکرہ ۱) اسے حفاظت میں لے لے ہوئے اٹھ، اور بنیاد رکھو اور اپنے رب کی بڑائی بول، رب کی بڑائی بول، یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج سے گزرتی رہی

سے صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابو بکرؓ سے صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المداۃ فلوحة عن الصلوة، شیخ ابن الاذی،
سے سیرۃ ابن ہشام، (ابتداء ما اقتضی اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)،

اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے اپنے ہونے والوں کو جگایا، بھوسے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا، خدا اور بندہ کے درمیان کے واسطے ہوئے شہر کو توڑا، گوشہ نشینوں کو پست کے ہونے کا ہڈی کے اور انیسٹ اور پتھر کے ان تہوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، وکیل کر نیچے گرا دیا، صرف ایک خدا کی ناز و نیاز میں باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے بعد کے کو حرام کر دیا اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے ناز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی، آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بہت بہت قوموں کی ناز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مشرور عاقلین، عیسائیوں کو غاصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا حق دیا، یہودیوں کو ناز کے مضموع و مشوع، راز و نیاز اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا، اور انبیائے عالم کی ناز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور صرح و حقیقت دونوں کیساتھ ناقابل تحریف و غیر متغیر و خود بخود دیا، حکم ہوتا ہے کہ

حَافِظُوا عَلٰی الصَّلَاةِ (بقصہ ۲۱-۲۲)

نازوں کی نگہداشت کرو،

یہ ناز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے، اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

وَهُمْ عَلَى صَلَاةٍ يُحَافِظُونَ (انعام-۱۱)

اور وہ اپنی ناز کی نگہداشت کرتے ہیں،

الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (مکاح-۱)

جو اپنی ناز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ،

اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نازوں کی نگہداشت

(مومنون-۱) کرتے ہیں،

خود انحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے، کہ خود بھی ناز پڑھو اور اپنے اہل عیال کو بھی اسکا حکم دو، اور اس ناز پر جب کام کے

قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ یہ رہنا فرمایا،

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا،

اور اپنے گھر والوں پر ناز کی تاکید رکھو، اور خود بھی اسکی

ادائیگی (پابند) رہو،

(طہ-۸)

ناز کیسے ہونی چاہئے؟ فرمایا،

وَقَدْ مَوَّاهُ لِلَّهِ قَائِمِينَ، (بقصہ ۲۱-۲۲)

اور خدا کے سامنے اسی طرح قائم رہو،

تعریف لگائی کر

الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (مومنوں)

وہ لوگ ہیں جو نماز میں خاشع کرتے ہیں

حکم ہوا کہ

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (اعراف - ۷)

تم اپنے پروردگار کو گرا کر اور چپکے چپکے پکارو،

وَادْعُوا خِفَاءً وَطَمَعًا (اعراف - ۷)

اور اس (خدا) کو ڈرو اور امید کیساتھ پکارو،

وَادْعُوا خُلُوصًا لَهُ (الذین) (اعراف - ۳)

اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو کسی کیلئے حاصل کرنے والے

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے،

اسلام میں نماز کا مرتبہ اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن جو کچھ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے، اس لئے اُن کے اندر سے کلام الہی اہمیت جاتی رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نمازی خدائے سامنے اقرارِ عبودیت اور الہی حمد و ثنا کو واضح معین اور تائید کی حیثیت حاصل نہیں یعنی کسی مذہب کے پیروں بلکہ ٹھون کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی، ورنہ جیسا کہ گذر چکا ہے اُن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تائید نہ کی ہو اگر موجودہ حیثیت یہ ہو کہ اسلام کے مواد کہیں نمایاں واضح اور نوکد صورت میں باقی نہیں ہی ہو اور اس کا سبب یہ ہو کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فرقہ فیلہ کی کو دینِ کمال میں ایسی نظم و وضع ہو کہ اور نمایاں صورت دی گئی ہو کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے،

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس تک نہیں کچھ بھی خوش و خوش باقی ہے کسی حالت میں بھی بیکار نہیں ہو سکتا، قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تائید ملی ہو، اس کے ادا کرنے میں سستی اور کٹاہٹی تفاق کی علامت ہے اور اس کا ترک کفر کی نشانی بتاتی گئی ہے یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا

لے منافقین کی ہفتہ ہیں ہر روز اَنَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ فَأَمَّا الْكُفَالِي (نساء - ۱۰۱) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سستے کابل ہو کر اٹھتے ہیں

اور اُس کی گلیل اُس شہستان شمس میں ہوئی جسکو مخرج کہتے ہیں،

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اُس کے لوازم ہیں اور اُس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے، چنانچہ سورۃ روم (۸۰) میں ہے:

حکم یہ دیا گیا کہ فَاَقْرَبْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین

تو حید پر سیدھا رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملتی ہے:

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُمُتَلِّئِينَ (اور نماز کو کھرا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ)

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب کے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے، اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم پروردگار اعلیٰ کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں خود اُس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آخرت معلوم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے، اور اُس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے،

چنانچہ اپنے فرمایا کہ نمازین کا ستون ہر جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی زخمیت ہو جاتی ہے، طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ اگر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز بھارا اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپ نے دو پھل باتوں سے مستثنیٰ کر دیا لیکن نماز کے متعلق فرمایا جس دین میں نہ لگے سامنے بھگتا نہ ہو اُس میں کوئی جلائی نہیں آچپے یہ بھی فرمایا ہے کہ نماز دل کی روشنی ہے، اپنی نسبت فرمایا ہے، نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے، ایک مثال میں اپنے فرمایا: انسان آگ میں جلتا رہتا ہے، اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے، یہ عجیب ازل کے جبر و فراق کی آگ ہی اور نماز آپ زلال ہے، جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کفر اور ایمان کے

دقیقہ مشیہ فرمایا: قَدْ خَلِقْتُ لَكُمْ مَعَالِيْنَ اَللّٰہِ یَوْمَ تَعْلَمُوْنَ (معاہوت - ۱۱) انکس ہے ان نمازین پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں،

سُحُفَ کُفْرٍ کَمِیْنٍ اِنَّہُمْ لَمِنَ الْمُتَغٰیبِیْنَ (مدثر - ۲) ہم نمازین میں نہ تھے یہ وہ اسی وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم وہ لوگ ہیں کہ تم

سے کتب ہمارے واقعات مروج و اسرار و عجیب غریب کتاب اللہ سے

درمیان امتیاز ناز ہی سے ہو کہ چونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ انہماک اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے، مسلمان کا وہ عمل جبکہ دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نازی ہی ہے، عین موقع جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ فرما رہے تھے نماز اور غلام !!

ناز کی حقیقت نماز کے لئے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے ہیں، اس لئے ناز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے، اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ناز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم علی ایک مسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک ائے اور وہ احمد لہے کہے تو اس کے جواب میں تم یہ حرکت نہ کرو، اتفاق سے ایک غمناز باجماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس میں شریک تھے، ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انہوں نے ناز کی حالت میں یہ حرکت نہ کیا، صحابہ نے ان کو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نازی میں کہا، تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہ نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے، نماز ہو چکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم میں کون باتن کرتا تھا لوگوں نے معاویہ کی طرف اشارہ کیا، آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں انسان کو باتن کرنا مناسب نہیں، حضرت انس کہتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ اللہ عشاء الخ العبادۃ دعا عبادت کا مغرب ہے اور حضرت عثمان بن عفیفہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ عشاء هو العبادۃ دعا ہی عبادت ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر تمہارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی، صہین عابری کا نام عبادت بتایا گیا ہے،

اسلئے یہ تمام حدیثیں کثر الاحوال کتاب الصلوٰۃ جلد ۱ میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں، اسلئے سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب تثنیت المائیں فی الصلوٰۃ یہ دو روایتیں ہیں، ہم نے ان دونوں کو جمع کر لیا ہے، اسلئے یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات میں ہیں دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء عابری اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء میں بھی ہے،

اِذْ حُفُوا۟ اَسْحَبًا لِّكُلِّ ذَاتِ النَّفْسِ الْمَذْمُومَةِ نَحْبًا وَمَا لَكُمْ مِنْ قَبْلِ كُرْخَا، جو لوگ میری بات
عَنْ رَحِمَتِي سَيَكُونُ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ^(۲۰۸) سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب جہنم میں جائیں گے،
مستدرک حاکم کتاب الدعاء میں ہے کہ اپنے فرمایا بہترین عبادت دعا ہے اس کے بعد آیت بندہ کو تلاوت
قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں ناز کی حقیقت صرف ایک نقطہ میں ظاہر ہو گئی ہے، یعنی
”خدا کی یاد فرمایا“۔

وَاقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي، (طہ - ۱) اور میری یاد کے لئے نماز کو قائم کر۔

کامیابی اسی کے لئے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے،

قَدْ اَخْلَعَ مِنْ ذِكْرِي اَوْ ذَكَرَ اللّٰهُ رَبَّكُمْ فَصَلُّوْا
کامیاب وہ ہو جس نے پاکی حاصل کی، اور خدا کا نام

یاد کیا پس نماز پڑھی، (اعلیٰ - ۱)

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی قلبی اضطراب، اور ذہنی شوش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز
فانی عقل کی ہر تہذیب و مادہ جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے، تو سکون و اطمینان کی راحت اُس کو شتر
اُسی ایک تابہ بطلق کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے، وحی الہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا،
اَلَا حَسِبْذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوْبُ، (معد ۴) ہاں، خدا ہی کی یاد سے دل نیکین پاتے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے هجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں،

وَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ الصَّلٰوةُ وَالصَّلٰوةُ، (بقرہ - ۵) ثابت قدمی اور نماز (دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں جان بچاؤ

زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدا سے قادر و توانا کے سامنے سرنگون ہے آسمان زمین چاند،

ستارے، دریا، پہاڑ، بجلی، چاند، چاند، پرنسب سب اس کے آگے سرسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بے چوچ
وجہ اطاعت کر رہے ہیں، یہی اُن کی تسبیح و ناز ہے،

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا اَسْبَغَ بِهِ جُحْدًا وَلٰكِنْ كَلَّا
اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی بھلا

تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ط (نبی اسرائیل - ۵)

تسبیح پڑھتی ہو، البتہ تم انکی تسبیح سمجھتے نہیں ہو

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ
وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ
وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالنَّاسُ وَكَثِيرٌ مِمَّنْ
النَّاسِ وَكَثِيرٌ مِمَّنْ عَلَيْكَ الْعَذَابُ ط (ط)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہیں
اور سورج، چاند، تارے، پہاڑ اور درخت، جانور اور بہت سے
آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس
کا عذاب ثابت ہو چکا کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء اس کے سامنے سرنگون ہو لیکن استثناء ہے تو صرف انسان میں کہ بہتر
اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہتر سے اس سے روگردان ہیں، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے، انسان کے علاوہ تمام
مخلوقات بلا استثناء اطاعت گزار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے
اپنے کام میں مصروف ہو، اور قیامت تک مصروف رہیگی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پاکر سرکش اور بغا
پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور
بندگی و سرفرازی کی دعوت دیتی ہے جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و ثنا اور
تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو، تو انسان کیونکہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے اور یہی نماز ہے،
نماز کی روحانی غرض و غایت | نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالق کل رازق عالم، مالک الملک، عظیم علم غایت
بخشنوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ادا کرے، اپنے دل اور زبان سے ادا کریں، تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و
کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھا جائے، اسکی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر
ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے
وقت اس کی ہر شے اور ہر بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں، اور ناپاک کلموں
کو کرتے ہوئے جھجکیں، اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں، صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم صحابہ کے جمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں اگر نماز کی حقیقت دریافت کی، آپ نے اس کی

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ
وَالْمُنْكَرِ ۚ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (عنکبوت ۵)

اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بچائی اور برائی کی باتوں سے روکتی
ہی، اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو کمیتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز براہِ یون اور حیائیون سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں ہے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے یعنی اس لمبی حالت کی یہ ایجابی سورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے چنانچہ

قَدْ فَتَحَ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ﴿۱۸۱﴾

کامیاب وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے

یعنی نماز پڑھے اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے

اِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ ۚ

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَرَزَقْنَاهُمْ تَزَكًى، فَإِنَّمَا يَتَزَكَّى
لِنَفْسِهِ ۖ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ

سے ڈرتے ہیں اور نماز پڑھی کیا کرتے ہیں، اور جو تزکیہ اور

دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا

(فاطر - ۱۰) ہر اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہوا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو ان کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی، اور اس کی روحانی
ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا،

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۖ إِذَا مَسَّهُ
الشَّرُّ جَزُوعًا ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۚ
إِلَّا الْمَصْلِينَ ۗ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ
دَائِمُونَ (معاہج - ۱)

بیشک انسان بے صبر بنا ہے، جب اس پر مصیبت آئے
تو گھبرا ادا اور جب کوئی دولت ملے تو نہیں پسند دے
نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز میں تدا
کرتے ہیں

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہو
نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا
کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو، جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن
پر یہ رہ سکتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی، نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح
پانی ہیل کو، ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے اگر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَوْفِي النَّهَارِ رُفْقًا مِّن لِّكِنَا
اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ لمحوں

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ
میں نماز پڑھی کیا کر دیکھیں یہ کیا برائیوں کو دور کر دیتی

ذُكِّرَ لِيْلَتِ الْكَوْبَيْنِ، (ہود - ۱۰) ہیں، یہ نصیحت ہوا اور کچھ والوں کو

۱۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کیساتھ آئی ہے، کنز العمال (جلد ۱۴ صفحہ ۶۷ و ۶۸) میں حاکم احمد ابن خزیمہ، طبرانی اور
بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں، ۲۔ صحیح بخاری کتاب مواقیات الصلوٰۃ و تفسیر سورہ ہود،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالاتی گئی ہو یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط | جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جنکی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج کی ضرورت پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ "نفیات"

یاد دماغی "کیفیات" کہتا ہے، اس کے لئے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جنکی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجہ مرتب ہوتے ہیں، سائنس کا لوجی (علم نفیات) کے کشف اور ترقی نے اب اس گروہ کو بالکل کھول دیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یاد و سروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور دلوں پیدا کرنا چاہیں، اور ان کے مناسب شکل و صورت، اور ماحول (گرد و پیش) اختیار کریں، تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی، ہمارے تمام تمدنی، اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں، اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں مہجدون ہیکلون اور گرجون میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، بجا یون اور کاتھولک کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و کاغذ گھنٹوں کی پر شکوہ آواز، اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں، شاہانہ رعب و اب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلو سوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے، قوی ہیکل چوہدار، عصا بردار، نقیب و چاوش، قدام کی زرق برق پوشا کین، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و تقارہ اور دبدم و درباش اور گاد و برو کی پر رعب سدائیں ضروری ہیں کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لئے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا، اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، ہر مروجہ عروسی کے لئے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا، اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے،

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے

مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی، اور خدا کی عظمت و کبریا کی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار نیز دل و مانع و نفس و روح میں پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے۔ اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کئے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے، اور اس میں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے، فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی ہول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہو، اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے، گجرات کا حول اور مسجد کا منظر دونوں کی کیفیت کو دہرایا کر دیکھا، اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے، اسی اصول کے ماتحت اسکولوں کی تنظیم، اور ان کی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہمرنگی و ہم لباسی، فوج میں وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہو، اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہتھم سکون و رزق کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری حرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصل کیفیت سے متکلیف ہوں، ان کی حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی کھینچ لیتی ہے، اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے، اسی لئے صلہ میں ایک کی ہمنسی سے سب کو ہمنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آ جاتا ہے، نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب، شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے،

ذکر و دعا و تسبیح کے ذریعے | یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود ان خضوع و خشوع، ذکر الہی، حمد و ثنا، اپنے گناہوں پر
ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہو یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق
رکھتی ہیں جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے، اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک
تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے، ارکان عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الہی ہے جبکہ
لئے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پائی
سکتی ہے، چنانچہ خدا نے فرمایا،

فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ (نشاہ) پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو،

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (ال عمران - ۲۰)

جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں،

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے، فرمایا،

رَبِّعَالٍ لَا تَلْبِثُهُمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَزَّ (ایسے لوگ ہیں جنکو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے

ذکر اللہ، (نور - ۵) مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے،

نماز میں طہن عبادت | دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کیساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے
کا نام ہے،

ذریعہ سے ادا کیجائے، اس کا نام نماز ہے، پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے، اور وہ ہر فرد کے

جد اگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے، اور نہ اسلام میں اسکو جماعت کیساتھ ادا کرنا مسنون بنا

گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے، جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے، کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن

دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لئے اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا

ہے، اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے، اگر اس کو جماعت کیساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائیگی

لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی نہ ملے گی، دوسرے نقطوں میں ہم اسکو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر و فکر اور سچ و سچانہ عمل انفرادی طریقہ عبادت ہے، اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان اور شرائط کیساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے، اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کیساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اسکو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اُس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج کے جس کے ساتھ اسکو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا اب تنہا رہ کر بھی اسکو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا،

غرض اس نظام وحدت کا اصول اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، وہی اصول حقیقت اسلام کا اہل راز بلکہ ستر الاسرار ہے،

اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ منہ گانی اور صوفیانہ نکتہ پروردی ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراش کرنا چاہئے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت، آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادائیج کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر چھونے والی دعوت محمدی کو قبول کیا فرض تھی، اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی، کہ جیسے چاہے جب چاہے جدھر منہ کر کے چاہے ادا کرے، تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جہانی ادائن سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی ختم صورت بن سکتے،

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہید کرنا توحید کا سب سے بڑا راز اور شعار ہے، اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں نبی و اجماع میں ہیں، ایک متحدہ جم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد

صورت و شکل میں واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام حیاتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے، قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و سخن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے، اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے،

نازین جہانی حرکات | یہ بھی ظاہر ہے کہ غماز کی اہل غرض غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے، جب کسی سے سوال کرتا ہے، تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے، تو اس کو دیکھ کر گھڑا جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل فروتنی، اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے، یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں، جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح غماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں،

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جہانی اعضا میں، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت و ولایت اور خیرگی ہونے کا دعوٰی کر سکتا ہے، اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے، جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے، کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عیسوی و النجا، اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں،

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے، اس کی زندگی کے دونوں جز خدا کے احسانات

انعامات سے یکساں گران یار ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے رُوحِ ادرہم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں، غرض یہ وجہ ہیں جنکی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے،

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے جہانی طریقے سے ہم کسی بڑے محن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، زمین پر سر رکھ دیتے ہیں، نماز کے بھی یہی تین رکن ہیں چنانچہ آغازِ عالم سے انبیاء کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعظیم انسانوں کو دی، وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی، کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجود)۔ ارکان نماز معلوم ہو چکا ہے کہ نماز "تلبّ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیم کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تعمیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اسکی غرض بھی بتائی گئی،

وَصَلِّ بِمِثْلِي لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَ
الرُّكَّعِ السُّجُودِ، (حج - ۴)

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان، قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریم کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا،

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي
مَعَ الرَّاكِعِينَ، (ال عمران - ۵)

اس نماز میں تین بھی، نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں،

نورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے، مگر شکل یہ ہے کہ ترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظوں کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیئے ہیں، جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک کشتہ پڑ جاتا ہے، بہر حال عبادتِ اور تعظیم کے تینوں طریقے، حضرت ابراہیم کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے، ذیل میں

ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں،

قسم | "پرابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا ہوا (پیدائش ۱۸-۲۲)

رکوع | "اور (ابراہیم) زمین تکسٹن کے آگے جھکا، اور بولا اسے خداوند (پیدائش ۱۸-۲۲)

سجدہ | "اور یسٹن کے خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی، اور ان کے دلوں پر نظر کی، انھوں نے اپنے سر

جھکائے، اور سجدے کئے" (خریج ۲-۳۱)

"تب ابرہام (ابراہیم) منہ کے بل گرا، اور خدا اس سے ہمکلام ہو کر بولا، (پیدائش ۱۷-۳)

"تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہاں گدھے پاس رہو، میں اس لڑکے کے ساتھ

(اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہاں تک جاؤں گا، اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس آؤں گا" (پیدائش ۵-۲۲)

"تب اس مرد (حضرت اسحاق کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند

ابرہام کا خدا مبارک ہو، (پیدائش ۲۴-۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا، (۲ سموال ۱۵-۳۲)

زبور میں حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طر تھے سجدہ کروں گا" (زبور ۵-۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الہی کے یمنیون ارکان موجود تھے، اور اسلام

نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل میں دعا و نماز کا ذکر متی ۶-۵، ۱۷-۲۱، ۲۶-۳۶، مرقس ۱۴-۳۳، لوقا ۲۲-۴۱ وغیرہ

میں ہے، طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا نہیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۴۱) اور دوسری

میں (متی ۲۶-۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے، اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے،

عہد نبوت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے، وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر

توراة یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے، اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے،

لَيْسَ اسْوَاءَ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ
تَشْهَدُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنْتَاهَا لِلنَّبْلِ وَهُمْ يُجْعَلُونَ
وہ برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو
رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے
کرتے ہیں (ال عمران ۱۱۲)

روایات میں ہے کہ رکوع میں یودیون کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں، اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یودیون بھی
نازکے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے،

اسلام کی نماز بھی انہیں نسیم ارکان اور فطری شکل و صورت کی ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیم کے عہد سے آتی
چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-
"اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یودیون اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔"

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا، انسانی آئینہ نشون کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ
یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نازکے بچان پیکر میں حقیقت کی روح چھونک دی، اس میں اخلاص کا جو ہر پیدا کیا
اس کو دین کا ستون بنایا، اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اسکی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح
اس نے اُس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا،

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکر الہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ
کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت
دی گئی ہے، اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے، تو نماز کو اُس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ
وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ، فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا
أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَدِّكُمْ وَاللَّهُ كَمَا
نمازوں کی ادائیگی کی نگہداشت کرو، اور خدا کے سامنے
اِدبے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر
(پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو

عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ، جیسے اُس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے،

(بقرہ - ۳۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس ذکر الہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جسکی علی شکل نماز ہے، اور اسی کی تفصیل سورہ نسا میں ہر اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے،

فَإِذَا قُضِيَتْ الصَّلَاةُ فَادْكُرُوا لِلَّهِ قِيَامًا وَقُومًا
پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے
فَقُومُوا أَوْ عَلَي جُنُوبِكُمْ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَسْكُتُوا
اور پہلوؤں پر یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے تو

الصَّلَاةُ ج. (نساء - ۱۰) نماز کھڑی کرو،

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں، اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی، اسکو الصلوة (نماز) کہا گیا، اور دوسری رکعت جو ضحاکا نام اٹھ کر بیٹھ کر جھک کر لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اسکو صرف ذکر اللہ کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی محض نماز کو "اقامت صلوة" (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا، حالانکہ ذکر الہی تسبیح و تہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے، بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوة (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر تسبیح و تہلیل حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جدا گانہ ہیں یعنی اقامت صلوة کے ضمن میں ذکر و فکر تسبیح و تہلیل حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے، اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر دستور نماز میں انکی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اُس نے بتایا ہے،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کیساتھ مقرر ہوئی ہے، گو اس کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی، اور صحاہ کس طرح کی نماز سکھائی کیونکہ نماز کی یہ علی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اُس عہد سے لیکر آج تک موجود ہے، اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے، اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور

علا بل اختلافِ مسلم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لئے قرآنِ پاک سے انکا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا،

ہم پہلے رب الغزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں،

حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوٰتِ وَ الصَّلٰوٰۃُ اَلْوَسْطٰی قِ نَمَازِیْنَ پَر (عموماً) اور بیچ کی نماز پَر (خصوصاً) نگاہ رکھو،

وَقُوْٓمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ، (البقرہ-۳۱) اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو،

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلَّی، (اعلیٰ-۱) اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی،

وَسَبَّحْتَ فَكَبَّرْتَ، (مدثر-۱) اور اپنے رب کی بڑائی کر،

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے،

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے، اور اُس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں،

فَسَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُومُ، (طہور-۲) اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

پھر قرآن پڑھتے ہیں،

فَاقْرَءْ وَاَمَّا تَتَسَوِّرَ مِنَ الْقُرْآنِ، (مزمل-۲) قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو،

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں، اور اس کی خصوصیت کیساتھ بیان کرتے ہیں،

جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے،

قُلْ اَدْعُوا اللّٰہَ اَوْ اَدْعُوا الذِّیْنَ اٰیَآمًا کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کلمہ پکارو سب اچھے

تَدْعُوْا فَاِنَّہٗ لَا سَمَآءَ لِحُجَّتِہٖۤ اَوْ لَا جَنَّتِہٖۤ اَوْ لَا تَجْمَعُہٗۤ اَوْ لَا تَفْصِلُہٗۤ اَوْ لَا تَحْفَافُتْ بِہَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِيْلًا نام اسی کے ہیں، اپنی نماز بہت زور سے پڑھو، اور نہ

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ یُخْیِیْذُ وَاَلَدًا اَوَّلُہٗ بہت چپکے بیچ کی راہ تلاش کرو، اور کہہ کہ خدا اس اللہ کی

جس نے کوئی مینا نہیں بنایا، اور نہ سلطنت میں کوئی

یُکَذِّبُ لَہٗ شَرِیْکَ فِی الْاَمَلِیْنِ وَلَہٗ یُکِنُّ لَہٗ اُنکا شریک ہے، اور نہ در ماندگی کے سبب، اوس کا

وَلْيَمْنِ الذَّلِيلُ وَكَتَبْنَا كِتَابًا، (اسرائیل - ۱۲) کوئی مددگار ہے، اور اسکی پڑائی کر، بڑی بڑائی

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ میں بہ تمام و کمال مذکور ہے، اسی لئے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں، اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے سامنے اوسے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں

وَازْكُوعُوا مَعَ الرَّائِعِينَ، (نقرہ - ۵) اور رکوع کرنے والوں کیساتھ رکوع کرو،

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْكُوعُوا وَاسْجُدُوا اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور پڑ

اغتبطوا وارتكبوا الخیر لعلکم رب کی پرستش کرو، اور نیک کام کرو، تاکہ کامیاب

تفعلون، (حج - ۱۰) ہو،

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تہجد کرتے ہیں،

تَسْبِيحٌ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ، (واقعہ - ۲-۳) تو اپنے بزرگ پروردگار (ربّ عظیم) کے نام کی تسبیح کرو،

تَسْبِيحٌ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى، (اعلیٰ - ۱) اپنے بزرگ رب (ربّ اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کرو،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدہ میں ادا ہوتا ہے،

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورہ حج (۲۴- ذکر ابراہیم) اور آل عمران (۵- ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ

ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے، سورہ نسا (۱۵- ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے، درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری

اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے، تعظیم کی ابتدائی

اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک

جاتا ہے، اور جب فطربے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصہ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور منظر

کے پست ترین حصہ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے، قرآن

نے کہا ہے،

وَالصَّبْرُ وَالْقُرْبُ، (علقہ)

اور سہ کر اور قریب ہو جا

گویا سجدہ قربت الہی کی اخیر منزل ہے، شاید ہی لئے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے،

ناز تمام جہانی احکام عبادت قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جہانی، انسانی اور فطری عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے،
 کا مجموعہ ہے،
 جم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے، اور سرنگون کرنے کا حکم ہے، مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی

تاکید ہے، خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جہانی، انسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے، اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگون جہانی، انسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے نقطہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأت قرآن، اذکار الہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہیں، ان کی مجموعی تعمیل کا نام ناز ہے، جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں، دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے، کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا، کہ جو چاہے رکوع کرے، جو چاہے سجدہ کرے، جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قرأت پر اکتفا کرے، اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرض الہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا، اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی، اور سہل بخاری ان پر سے احکام کی تعمیل میں مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہو سکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جاسکتا، اور نہ جماعتی رموز و شعار کی وحدت کی شان اُس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی،

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی علامت تعلیم دی، اور رسول نے امت کو سکھایا، اور امت

لئے مرقا امام مالک رحمہ اللہ جاری کتاب الصلوٰۃ،

نے نسل بعد نسل موجودہ اور آئندہ نسل کو سکھایا، اور اس پورے تواریخ کے ساتھ جس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے،

نازکی دعا | نازکی مختلف حالتوں میں اُن حالتوں کے مطابق مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں، اور پڑھی جاسکتی ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نازکی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، لیکن نازکی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کے ناز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، جس کو اپنے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے، اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورہ فاتحہ ہے، جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لئے وہ اسلام میں نازکی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی،

الحمد لله رب العالمين! الرحمن الرحيم!	حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے
ملك يوم الدين! اياك نعبد و اياك نستعين!	رہم والاہر بان ہے، ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے) (لے آقا!) ہم تجھی کو پوجتے
اهدنا الصراط المستقيم	ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو سیدھا راستہ
صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين	چلا، ان کا راستہ خیر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہیں خیر غضب آیا اور نہ انکا جو بہک گئے،

(فاتحہ - ۱)

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں، یعنی اسے خدا تو اسکو قبول کرے)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے، جس کے بغیر ہر نماز نامہ اور ادھوری رہتی ہے۔ یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا لے جانے کی قرأت فاتحہ،

یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہو، اچھون کی تقلید کی آرزو اور بدوں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت "کل جانوں کا پروردگار" زبان پر آتی ہے، تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں سب سامنے آجاتی ہیں، "جانوں" کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، سارے جانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، انسان ہون کہ حیوان، چرند ہون کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہون یا غریب، مخدوم ہون یا خادم، بادشاہ ہون یا گدا، کالے ہون یا گورے، عرب ہون یا عجم کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے، خدا کو "رحمان و رحیم" لکھ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابل بیان کیف محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے، "روز جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے، ہم بھی کو پوچتے ہیں "کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں، ہم بھی سے مدد مانگتے ہیں" بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے، اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بن جاتے ہیں، سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں

قُلْ تَعَالَوْا اَنْتُمْ مَآحِرُ رَسُكُمُ عَلٰی كُفْرِكُمْ اَلَا تَنْشُرُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ ۖ بَعْضٌ نُّزُرُكُمْ وَاٰیَاهُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْا الْفُؤَادَ ۚ جِنَّ	کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں
وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ ۖ بَعْضٌ نُّزُرُكُمْ وَاٰیَاهُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْا الْفُؤَادَ ۚ جِنَّ	جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کی ست
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَاِمَّا بَطْنٌ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ	شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت
	کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور
	ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے

الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصَّيْكُمْ
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ
الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ
أَشُدَّهُمْ وَأَوْفُوا بِالْكَيْلِ وَالْمِيزَانِ لَا تَقْسُطُوا
لِالنَّفْسِ النَّفْسَ الْأَوْسَعَهَا وَإِذَا
قُلْتُمْ فَأَعْدِلُوا وَكَانَ ذَا قُرْبَىٰ ج وَ
بِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّيْكُمْ بِهِ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ هَٰذَا صِرَاطٌ
مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ

نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہو یا
باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو
مست مارو، لیکن انصاف کیساتھ، یہ وہ باتیں ہیں
جس کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو، اور یتیم
کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے
بیان تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے، اور تپا
اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، تم کسی کو اس
کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے، جب تم بات
بوتو تو انصاف کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو،
اور خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتیں ہیں جس کا خدا نے
تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم نصیحت پکرو، اور بے شہہ رہو
میرا سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو

(العام - ۱۹)

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحیِ محمدی کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، مان
باپ کیساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور
بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایماندار سی، بلا رونا
سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی مختصر سی ترکیب توصیفی میں ہم خدا
سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں،

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جنہر اُس کا فضل و انعام
ہو، یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآنِ پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے،

وَمَنْ يَطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ
 الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ الَّذِينَ
 وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ
 وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (نساء-۹)

اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں، تو وہ ان
 لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا،
 یعنی نبی، صدیق، شہید، اور صالح لوگ، ان کی
 رفاقت کیسی اچھی ہو

اس بنا پر ہر نمازی جس صراطِ مستقیم اور راہِ راست کے لئے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے،
 جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین) علی قدر مراتب چل چکے،
 سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، (۱) افراط (زیادتی) کے سبب اور (۲) تفريط (کم)
 کے سبب۔ افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے، اور
 تفريط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے، اور ہر قسم کا انعام
 و اکرام چھین لیا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں، جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں
 باتیں اضافہ کر دیں، دوسری کا نمونہ یہود ہیں، جنہوں نے احکام الہی کو پس پشت ڈال دیا، اور ہر قسم کے
 انعام و اکرام سے محروم ہو گئے، مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور
 اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا،

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی یہ دعا (سورۃ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح
 کی نیکیوں پر مشتمل، اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس میں خدا کی حمد بھی ہے، اور بندے کی التجا
 بھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا:-

جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز
 میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لئے
 ہے، اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب الحمد للہ رب العالمین (حمد ہو سارے جہانوں کے

پروردگار کی کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: "میرے بندہ نے میری ستائش کی، پھر جب وہ
 الرحمن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: "میرے بندہ نے میری تعریف
 کی۔" پھر وہ کہتا ہے مالک یوم الدین (نیک بے کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے
 "میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی، اتنا میرا حصہ ہے، اور میرے اور میرے بندہ کے
 درمیان مشترک یہ ہے، کہ ایک نعبہ و ایک نستعین: دہم تجبی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد
 چاہتے ہیں، اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراطِ مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور
 میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا۔"

اس حدیثِ قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اُس دعا کا جو دلکش و دل فریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح
 میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یوژوین
 فاضل اے جی وینسنگ (A.G. WENSINCK) کو بھی جس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اسلامی
 نماز پر ایک پر معلومات مضمون لکھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"(اسلام کے روستے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے، ایک دفعہ مجھ نے
 ایک نقش و نگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نمازیں تو جہنمی ہے، یہ واقعہ
 کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی
 ضرورت ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جہین مجھ نے کہا ہے، کہ مجھے تمہاری
 دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز جو
 مجھ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منتقل ہے، نماز کی ایک سب سے
 اعلیٰ خصوصیت وہ ہے، جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جنہیں بیان ہے کہ نماز

خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے۔ اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے:

کہ "سورۃ النحل میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔"

اس عاصی محمدی کا موازنہ دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کیلئے دوسرے انبیاء کی مخصوص دعاؤں سے

میں جو دعا پڑھی تھی وہ تورات کی کتاب خروج میں موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل میں حضرت عیسیٰ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے، ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیر کیفیت، جن تعبیر جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہوگا، اور پتہ چلے گا کہ انکی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نمازون میں پڑھنے کے لئے اسی کا انتخاب ہوا، اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی سے فرمایا تھا کہ "نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی اُمّ القسْرٰن، تم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ تورات میں اترے نہ انجیل میں نہ زبور میں، اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔" اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰ کی نماز | تورات کی کتاب خروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ تورات لینے اور ربانی تختی کا ایک ٹکڑا دیکھنے کے لئے کوہ طور پر چڑھے، اور تختی نظر آئی، تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ دعا تعلیم کی،

خداوند خداوند خدا، رحیم اور مہربان، قہر مند، دھیم اور رب، فیض و وفاء ہزار شہادت کیلئے

فضل رکھنے والا، اگنہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا

لکھنؤ، ۱۰ جون ۱۹۰۷ء
حضرت ابی بن کعبہ رضی اللہ عنہ
نے یہ دعا سونپ دی تھی

بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے اتھری

اور چوتھی پشت تک لیگا۔ (۲۴-۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں، لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہوا پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے،

زبور میں حضرت داؤدؑ کی ناز کی دعا | زبور باب ۸۶،

داؤد کی ناز

”اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سُن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں نام دن تیرے آگے نہ کرتا ہوں، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے، اور سببنے والا ہے، اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں، وافر ہے،“

اے خداوند! میری دعائیں اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بہت کے دن تجھ کو پکاروں گا، کہ تو میری نیکو، معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہیں، اور تیری صنعتیں کہیں نہیں، اے خداوند! ساری تو میں جہنم تو نے خلق کیا، آئینگی، اور تیرے آگے سجدہ کریں گی، اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے،

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتائیں، تیری سچائی میں چلوں گا، میرے دل کو مکلف کر، تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل

سے تیری ستایش کروں گا، اور اب تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت

مجھ پر بہت ہے، اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہو،

اے خدا، مغرور دن نے مجھ پر چھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے، اور انھوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا، لیکن تو اے خدا

خدا کریم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے، اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری

طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش، اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو

نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں، دیکھیں اور

شرمندہ ہوں، کیونکہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔

اس دعائیں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، راہِ راست کی ہدایت کی طلب

اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول، تکرار اور دہرائی کے واسطے کی

شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی، اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت

کی ناز میں پڑے جانے کی سفارش کرتا ہے،

انجیل میں ناز کی دعا | حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جو ایون کو دعا، اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تسلیم

کرتے ہیں:-

”اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری

مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے، اور

ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں، اور ہمیں

آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ

تیرا ہی ہے، آمین،

نام کی تقدیس "خدا کی حمد" ہے، "بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استعارہ کی زبان میں "روز کی روٹی" سے مراد دنیاوی روٹی نہ لیجائے، بلکہ روح کی غذا یا صراطِ مستقیم لیجائے، اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں، "ازمایش" میں نہ پڑنے اور "برائی" سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہیں، جو اسلامی دعار کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ "نہ ان کار استہ ہو جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں"۔

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبانِ نبوت سے ادا ہوئیں کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیلِ دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آسکتی ہے، دعائے محمدؐ می تکمیلی شکل کی ایسے دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے بھرپور ہے، خدا کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہوا اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہرِ بیہوش کی لغزش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت "قرض" لینے پر آمادہ کرتے ہوں، نیز وہ خدا کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جن میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے؟ خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا، یعنی ربوبیت، رحمت، اور ملکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں، جن کا تعلق پیدائش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے، جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیز نگیناں ظاہر ہوتی ہیں، ملکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا منظر ہے، اور پوری سورہ دعار کے اغراضِ ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے، طرزِ بیان خدا اور بندہ کے شایانِ شان ہے، درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں، اوصافِ الہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب

ہو سکتے ہیں، دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے، لہذا اور روحانیت کا کمال، منہا
 فطر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کثرت
 اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے مناسب موجود ہے، یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کیساتھ جگہ گھیر لی
 اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و
 شوکت، شفقت و رافت، اور بندہ کے خشوع و خضوع، بندہ جو صلی، صداقت طلبی، کا ایسا جامع، مختصر، اور
 پُر اثر بیان سورہ فاتحہ کے سوا اور کمان مل سکتا ہے؟

ناز کے لئے تعین اوقات | ناز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکبیلی کارنامہ اوقات ناز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا
 کی ضرورت کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کیلئے

وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا ناز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری
 تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے، اس کی بڑی خصوصیت یہ
 کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے ناز کی تعلیم دی، تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ
 اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولوجیکل)
 خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرے
 کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا، اسی لئے ہر منظم باقاعدہ اور دائمی عمل کیلئے
 اوقات کی تعیین ضروری ہے، اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لئے اختیار کیا ہے
 اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کی یہ ۲۴ گھنٹوں
 کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہ تک
 کہ دن تمام ہو جاتا ہے، اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے، اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا، لیکن جب کاموں
 کے لئے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے، اور وہ

وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلانا رہتا ہوا، محکم کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے جاتے ہیں،

اوقات نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مد نظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رفر اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہروں، ملکوں، اور اقلیموں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا موقع بنجاتی ہے، اگر وہ زمین لگی ہوئی دو زمین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگون پاؤ گے، اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا، یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہیگا، مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا، تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اُسی حالت میں ہوتا ہے، تو نماز کا فرض اس وقت ہاں ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحہ ارضی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے،

نماز کے اوقات دوسرے ایسے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے،
 مذہبوں میں اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر

کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زرتشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمرہ خوان ہوتے ہیں، روہن کی پختہ لک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے پھر شام کو پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جنکو "تفلا" کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے،

”جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھری کا

دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا

کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گزاری (حمد) کرتا رہا۔

... پھر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے" (۶-۱۰ تا ۱۳)

حضرت داؤد کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے،

"پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے پالے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فرماؤں

کروں گا، اور نہ کروں گا، سو وہ میری آواز سن لے گا" (۵۵-۱۶ و ۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر، اور مغرب کی نمازین کہہ سکتے ہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، اوقات کی انہیں میں سے

"پھر اس نے (حضرت عیسیٰ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضروری

ہے، ایک تقش کی" (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے

جو یہودیوں میں تھے، اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے:

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا" (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے،

پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر بیکل کو چلے" (اعمال ۳-۱)

یونانی میں تیسرے پہر کے بجائے "نویں گھڑی کو" لکھا ہے جبکہ ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر

اعمال ۱۰-۱۱ میں بھی ہے،

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا، کہ دعا،

کا بہترین وقت آدھی رات ہے،

"اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا، جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردوں

مین سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰ)

نے اپنے شاگردوں کو سکھایا، اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو . . .

. . . اس نے ان سے کہا تم مین سے کون ہے جبکہ ایک دوست ہو اور وہ

اُسی رات کو اس کے پاس آ کے کہے اے دوست مجھے مین ردی ادھار دے، (لوقا-۱۱)

اس تمثیل مین حضرت عیسیٰ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انھیں گرفتار کیا

گیا، وہ ایک جماعت کیساتھ اسی نماز تہجد مین مصروف تھے، (لوقا ۲۲-۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل مین موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت مین ہے "اور بڑے

ترکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھکے نکلا اور ایک ویران جگہ مین گیا اور وہاں دعا مانگی۔ بلکہ عربی ترجمہ سے جو

براہ راست یونانی سے ہوا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو اُما اس وقت نماز پڑھا کرتے

تھے، چنانچہ اس مین اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وَفِي الصُّبْحِ بَاكِرًا قَاهِرًا وَخَرَجَ إِلَى مَوْضِعٍ خَلَاءٍ وَكَانَ يَصَلِّي

هناك، یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے،

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابوں مین مذکور ہیں ہم جمع کر لیں، تو وہی اسلامی

نماز کے اوقات ہو جائیں گے، جنھیں صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (د-۱۶ اور

۱۷) مین صبح کا مرقس (۱-۳۵) مین، عصر کا اعمال (۳-۱۰، ۳-۳۰) مین ہے اور عشاء رات کی نماز

کا لوقا (۲۲-۳۹) مین!

نماز کے لئے مناسب اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعاؤں نماز

فطری اوقات

مین مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و ذوقی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن

اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات متعین

لے مطبوعہ لندن ۱۹۶۵ء ۲۵ مطبوعہ مصلیہ ادبیہ بیروت ۱۹۵۵ء مطبوعہ اگسٹورڈ سن ۱۹۵۹ء

کر دیئے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہو،
 دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے، اور اس کو
 تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آکر خانگی زندگی کا آغاز
 کرتا ہے، اور کھاپی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں
 کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل
 کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نورِ ظہور
 کے وقت جب صبح کی نسیم سہری حنی علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزاسناقتی ہے اور ہر شئی کی زبان سے عالم
 کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لئے بھی تہنیت
 موزون ہے، کہ کتاب زندگی میں حیاتِ امروزہ کا ایک نیا ورق اُس وقت کھلتا ہے، اس لئے
 مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرائقش ہو، اس کے بعد انسان
 اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے، اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار
 کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے
 کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح
 اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں، تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد
 شام ہوتی ہے جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و
 سکون کا دور شروع ہوتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ اسکا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت
 جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام
 لیکر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی
 کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہلے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں،

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لئے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے، یہ وقت صرف عذابِ راحت کے لئے موزون ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام انسان کے کام کے ہیں، ان کے کام کے اوقات کے شروع میں نماز بچگانہ مقرر ہوئی ہے،

اسلامی اوقات نماز میں | اوقات نماز کی تعیین میں اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ایک نکتہ، تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے

شرک کا سب سے بڑا منظر جسد کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ ملکیتِ نیروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے،

سب سے پہلا موقع جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زہانِ حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اُس خدائے برحق کی عبادت ہو جس کے استثناء کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی میں تھے،

دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردہ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی تین دور ہوتے ہیں، جب سر دمست الراس سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے، جس کو عصر کہتے ہیں، اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے، جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقات انحطاط میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے، اُس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تارک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے،

اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِ الشَّمْسِ اِذَا
غَسَقَ اللَّيْلُ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ (اشراۃ: ۱۸)
نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت رات کی
تاریکی تک (نظر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز
(تفصیل آگے آتی ہے)

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلنے کے وقت، اُس کے عروج و کمال کے وقت، اور اُس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں، اسلام میں نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں اور کس کے رکعتیں کر کے پڑھنی چاہئے، اور اس کے طریق و اوقات نماز کیا کیا آداب و شرائط ہیں، ان سب کے لئے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے، جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ
وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ، فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَلَا
أَوْ سُبُلَانَا فَاذْأَمْسِكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا
عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ،

نازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو، اور اللہ
کے لئے (نازین) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر ڈھمکنے
کا خوف ہو تو پیادہ ہو کر، یا سوار ہو کر (ناز پڑھو)
پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد
کرو جس طرح اس نے تم کو سکھا یا جس سے تم پہلے

واقف نہ تھے،

(بقرہ - ۳۱)

اس آیت پاک سے یہ بات تبصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات
میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہئے خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآن
پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریراً، اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسل متفقہ
تواتر عمل میں عملاً موجود ہے، اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں،

نازوں کی پابندی | اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت
دگرانی، رکھیں اور ان پر مداومت کریں، قرآن پاک میں نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت
کے لئے ایک خاص لفظ ”حَافِظْتُ“ کا استعمال کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی دگرانی کے ہیں، اور جس کی
وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا، اور بشرط ادا کرنا سب داخل ہیں، فرمایا،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ، (بقرہ - ۳۱) نازوں کی نگہداشت رکھو،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (معا - ۱) اور جو اپنی نماز کی نگہداشت رکھتے ہیں،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (مبین - ۱) اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھتے ہیں،

وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (انعام - ۱۱) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت رکھتے ہیں،

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا،

الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ، (مکاح-۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،
 ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا
 اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے،
 نماز کے اوقات مقرر ہیں اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے
 ہیں اور شاید ہے،

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا
 مَوْقُوتًا، (نساء-۱۵) فرض ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لئے اوقات مخصوص ہیں،
 وہ اوقات یہ ہیں ادا سے نماز کے لئے قرآن سے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہیں، صلوة یا اقامت
 صلوة، تسبیح، اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامت صلوة نماز کے لئے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ
 عام تسبیح و تحمید اور یاد الہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے جس کا جز اعظم تسبیح و تحمید ہے، احادیث میں بھی تسبیح
 کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں، اور اشعار عربیہ و نسبت عرب سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن میں جب
 اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد
 نہیں ہو سکتی، کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے، البتہ اوقات
 کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے،
 اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہئے،

سہ صحیح مسلم باب صلوة الضعی، ما رايت رسول الله صلعم يصلي سجدة الضعی قط، وانی لا استجیب لایزجیح مسلم، باب جواز ان فلت
 علی الدابة و باب و کنت ابته فقام قبل ان اقضى بیعتی،
 سہ اثنی و اثنی کاشعرت، و سبج علی حین العشیات و الضعی ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا (شعراء الجاہلیہ)
 جلد ۳ صفحہ ۳۶۵ سہ لسان العرب جلد ۱-۳ صفحہ ۱۴۷

۱۔ رات کو کھڑا رہ کر اگر کچھ کم، یا آدمی رات

بواس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھالے اور قرآن

(اسین) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ

۱۔ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا تَصِفُهُ أَوْ تَقْصُرُ

مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ نَسِيتَ عَلَيْهِ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ

تَكْوِيلًا (منزل-۱)

۲۔ اور اپنے پروردگار کی ہر سہ پہر اور صبح کو کر

۳۔ اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو

۴۔ اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو

۵۔ اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں

گر گزرا کر اور ذکر کر اور پست آواز میں

صبح کو اور سہ پہر کو یاد کر اور بھولنے

والون میں سے نہ ہو،

۶۔ اور (اے رسول) اُن کو مت نکل

اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارنے میں

۷۔ ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم

خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام

لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جنکو دنیا کا

کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا صبح اور سہ پہر

خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں،

۸۔ اور تو (اے رسول) اپنے کو اُن لوگوں

کیساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر

اور سہ پہر کو پکارنے میں

۲۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَاءِ وَاللَّوْنِ

۳۔ وَسَبِّحْهُ بَكْرَةً وَأَصِيلًا (احزاب-۶)

۴۔ وَتَسْبِيحًا بَكْرَةً وَأَصِيلًا (فتح-۱)

۵۔ وَادْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا

وْخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ

بِالْعُدُوِّ وَالْأَصَالِ لَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ

(اعراف-۲۴)

۶۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ

بِالْعُدُوِّ وَالْعَصَى (انعام-۶)

۷۔ فِي بُيُوتِ الَّذِينَ اللَّهُ أَنْ تَرْفَعَ

وَيَذْكُرَ فِيهَا اسْمَهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا

بِالْعُدُوِّ وَالْأَصَالِ سِرَّ جَالٍ إِلَيْهِ

(نور-۵)

۸۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ

رَبَّهُمْ بِالْعُدُوِّ وَالْعَصَى (كهف-۴)

- ۹۔ اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر
جب تو اٹھتا ہے، اور رات کے کچھ حصہ میں اسکی
تسبیح کر اور ستاروں کے پیچھے پھرتے وقت،
۱۰۔ اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور
رات کے کچھ ٹکڑوں میں،
۱۱۔ نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات
کی ابتدائی تاریکی تک، اور فجر کا پڑھنا،
بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے، اور رات کو
کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ، (تجدید)
۱۲۔ اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر، صبح کو،
سہ پہر کو، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور
بڑی رات تک اسکی تسبیح کر،
۱۳۔ کافروں کے گے پر صبر کر، اور اپنے پروردگار
کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے، اور
اس کے ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے کچھ حصوں
میں اس کی تسبیح پڑھ، اور دن کے کناروں
میں، تاکہ تو خوش رہے،
۱۴۔ تو خدا کی تسبیح پڑھ، جب شام کرو، اور جب
صبح کرو، اور اسکی حمد آسمانوں، اور زمین
- ۴۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ وَ
مِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ
(طور - ۲)
۱۰۔ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفًا
مِنَ اللَّيْلِ، (هود - ۱۰)
۱۱۔ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لَدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى
غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ، إِنَّ قُرْآنَ
الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ
بِهِ نَافِلَةً لَّكَ، (اسرائیل - ۹)
۱۲۔ وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا
وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا
طَوِيلًا، (دھہر - ۲)
۱۳۔ فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ
غَدُوبِهَا وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ
وَاطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى،
(طہ - ۸)
۱۴۔ فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ
تُصْبِحُونَ، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ

- وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ (رو-۲) مین اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کو،
- ۱۵۔ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ۝۱۵۔ تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر، اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد، (رق-۳)
- ۱۶۔ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ، (نور-۸) ۱۶۔ فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گری کے سب سے کپڑے اتارتے ہو اور عشا کی نماز کے بعد،

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے۔ ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسل ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہیں، غدا، عدا، بکرہ، فجر قبل طلوع شمس اور عین تصبؤن کے معنی صبح کی نماز، اصل، عشی، اور قبل غروب شمس سے مراد عصر، ولوک شمس (زوال) اور عین ظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ) اور شمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من اناریل (کچھ رات گزرے) غسق ایل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوۃ النشار سے مقصد عشا کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات میں جنہیں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے،

اوقات کی تکمیل

نازوں کے اوقات | اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے، کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کیساتھ
کی تدبیریں تھیں، ہوا تھا اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات
کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورہ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں
میں ہے، یہ آیتیں آئی ہیں،

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ «قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا»
تَصَفَّهْ أَوْ اقْصُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ
عَلَيْهِ زَكَاةً فَكَانَ تَوَكُّلًا أَنَا سَلَفُ
عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ
هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا إِنَّ لَكَ
فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا

اسے کلی اور ڈھکے سونے والے، تھوڑی دیر کے علاوہ
ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، ادھی رات تک پاس
سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ، اور اس میں قرآن
ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات
ڈالنے والے ہیں، یعنی دشمنیت کے مفصل احکام
اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز
پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہو، اور قرآن
بجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہو، بے شبہ تجھ کو

دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے،

(مزمّل - ۱)

ناز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برنٹا نہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں
وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء - ۱۱) (اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہشیار کر دو) کے ذریعہ سے

دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، اور میں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَلِكُ
حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقْلُبُكَ فِي السَّاجِدِينَ
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ،

(شعراء - ۱۱) سنا اور جانتا ہے،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہو، اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پرخطر حالت میں آپکا راتوں کو تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے، اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبت اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکیں کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشا) اور تاروں کے جھللاتے وقت بھی آپ ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۝
سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنْ اللَّيْلِ
فَسَبِّحْهُ ۝ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ،
اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بیشک تو
ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور اپنے رب کی
تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت)
اٹھتا ہے، اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح

(طوس - ۲) کر، اور ستاروں کے پیٹھ پھرتے وقت،

یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے، اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی،

صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبر بن مظہر،

اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلعم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب، اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے، سورہ دہرین جو جمہور کے نزدیک نئی ہے، اور غالباً سورہ طور کے بعد اترتی ہے، انہیں معنوں کی ایک اور آیت ہے، جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہتے اور بڑھتی ہے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مَنْهُمْ آثِمًا
تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان
أَوْ كُفُورًا، وَأَذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً
خالفوں میں سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گدا
وَأَصِيلًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَ
کا کہنا نہ مان، اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے
سَبِّحْهُ كِبْرًا وَسُبْحًا،
پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ

(دھر-۲) کر، اور رات کو دیر تک اسکی تسبیح کیا کر،

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن، اور ابتدائی شب، اگر ہنوز "اصیل" میں ظہر و عصر اور من اللیل (رات) میں مغرب اور عشا کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو، اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے،

اب یہ ان تین وقتوں کی "تسبیح و تحمید" باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہیں حکم ہوتا ہے،

أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيْ النُّجُومِ قَرْنًا
دن کے دو دنوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر)

لہٰذا "اصیل" دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشتیٰ لکھے ہیں، جو عصر کے لئے سورہ روم میں استعمال ہوا ہے، طے طری النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے، قبل طلوع الشمس و قبل غروبہا، بالعتشیٰ و الا بکبار، بالغد و الا اتصال، بین پہلا طرف فجر، بکرة، اور غدوہ، دوسرا طرف عصر، عشتیٰ اور اصیل ہے،

مَنْ أَيْلٍ، (ہود-۱۰) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر،

یہ آیت سورہ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے، اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں ”تبیح“ کے بجائے باقاعدہ ”صلوٰۃ“ کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے،

فَاسْتَفَعُوا كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا، (ہود-۱۰) پس تو سیدھا چلا پل، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ جنہوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی

سیدھے چلین)، اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو، اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں، ایک ٹنڈ دن کے ایک کنارے میں، یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تار دن کے جھللاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب، اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں، پہلی سے صبح کی نماز دوسری سے عصر کی جبکہ پہلے اکیلے کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجال اور ابہام تھا، دوسری میں ظہر و عصر، اور تیسری میں مغرب و عشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں، اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں، سورہ قین میں جو کئی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے،

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمِنْ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ النُّجُودِ، پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر، اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار

کی تسبیح کر، اور کچھ رات گئے پر (عشا) اس کی
تسبیح کر، اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے بعد
رغوب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح

ممبر کی یقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایندھن
کے درپے تھے، اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ایہام دور کر کے مغرب اور عشا کی تعیین کر دی گئی
ایک کی نسبت کہا گیا وَمِنَ اللَّيْلِ (کچھ رات گئے)، اور دوسری کی نسبت کہا گیا وَاذْبَارَ السُّجُودِ (آفتاب
کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبت کفار سے
محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اھیل، اور پھر طرفی التھار
(دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں "قبل غروب" کی نماز کہا گیا ہی، ہنوز تفصیل طلب ہے،
جس کے اندر طلوع و عصر دونوں نمازین داخل ہیں، چنانچہ سورہ روم میں جو کہ میں نازل ہوئی ہے، اس
کی تفصیل کی گئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل
کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لیکر آٹھویں نوین سال تک ہے،
فَبُحِّانَ اللّٰهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ

اللہ کی تسبیح کر جب شام (یا رات) کر دو، اور

آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے، اس لئے ادبارِ سجود سے ادبارِ سجود الشمس مراد ہے، جیسا کہ قبل الغروب سے
قبل غروب الشمس مقصود ہے، آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہی، جیسا کہ صحیح تجارتی وغیرہ کی احادیث میں ہے،
کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے، چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا، اس لئے کام کی فصاحت
کا اقتضایہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے، چنانچہ اس معنی کے لیے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا، سجود اصل میں زمین
پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں، اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے، اس طرزِ ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید
مقصود ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجودِ شمس کا ذکر کیا، کہ جس وقت آفتاب کا سراپنے خالق کے آگے سجدہ میں
ہو، تم بھی اپنا سراپنے خالق کے آگے جھکاؤ، تفسیرِ دون میں حضرت علیؑ سے روایتیں ہیں، کہ اس سے مراد مغرب کی
نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں،

تُصَبِّحُونَ، وَلَهُ الْمُلْكُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ، (روم-۲) اور آیتوں کو انکی تسبیح کرو، اور جب ظہر کرو،

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی بہم نازوں کی توضیح کی گئی ہے ایک کو عشتی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا تصریح ذکر، طہ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں، ظہر کا بالاجال، دہر، ق، طہ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طہ، ق اور روم میں، مغرب کا بالاجال ہود، طہ، اور روم میں اور بالتصریح ق میں، عشا کا بصورت صلاۃ اقل، منزل، طور اور دہر میں اور بصورت عشا، بالاجال طہ، ہود، اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے، تمام نازوں کا بالاجال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طہ میں ہے بطور سے فجر اور عشا، دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود، اور طہ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طہ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع
بین الصلواتین

اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نازین محل ہیں، یعنی دونوں کو ایک لفظ "قبل الغروب" یا "اویل یا ظہر" کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخری آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر و عصر کی نازوں کا نام تصریح ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نازین اجمال ہے، یعنی مغرب و عشا دونوں کو حین تَصَبُّونَ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونوں محل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں

ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں،

اوقات پنجگانہ اور محدثین اور مورخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی آیت اسرار ہے، جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال

پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقات پنجگانہ کا ذکر سورہ قی اور روم میں موجود ہے، جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں لیکن اقامت صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسرار (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورت صلوٰۃ اسی معراج میں ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے، سورہ اسرار (معراج) کی وہ آیت جن میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے، حسب ذیل ہے،

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِكَ الشَّمْسُ إِلَى غَسَقِ
الْبَيْتِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ
مَشْهُودًا (اسراء: ۹۰)

آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک
نماز کھڑی کرو اور فجر کی قرأت قائم کر اے نبی
فجر کی قرأت میں حضور ہوتا ہے،

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے، اس میں

(حاشیہ ۱) علامہ موطا امام مالک رحمہ اللہ نے باب الفجر فی الصلوٰۃ فی السفر و الحضر بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں، اولاً ایک پونہ یا آفت اسلام میں فاضل و نیک کو بھی یہی شبہ ہوا ہے، دیکھو اسکا مضمون صلوٰۃ مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازین ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی تھیں، البتہ بضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے، کچھ تین اتنی ہی رہتی تھیں، صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی، فقہاء میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نماز کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جاسکتا ہے، احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر جمع بین غزوات میں و روزی الحج کو ظہر و عصر و زون ظہر کے وقت ادا کیا جاتی ہیں کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کیلئے ہے، بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں، بلکہ محض صورتہ دو دو نمازین ایک ساتھ ادا کیا سکتی ہیں، اسکی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے، حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقتہً دو نمازین یکجا ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہیں اور آنحضرت صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے، نتیجہً جن میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے

سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے، دلوک کے اصلی معنی "جھکنے" اور "مائل ہونے" کے ہیں، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہل عرب اس کو کن معنی میں بولتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے، زوال پر، مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر، اور غروب پر، اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو، تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی، غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب دھلنا شروع ہوتا ہو، تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطہ سمت الاراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے، اور تیسرا دائرہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا، اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید اور خداے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت "غسل" (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشا کی نماز ہے، اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہئے، جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو برتو جاباتِ ظلمت میں چھپ جاتا ہے، لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی، تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے، اور پانچویں نماز کا وقت "قرآن الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کیجاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے، اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں، بترسی ظاہر کرے، غرض اس آیت پاک سے اقامتِ صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا،

دلوک کی تحقیق مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کیے ہیں یعنی مقابل نقطہ نگاہ سے ہٹ جانا، اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ

لسان العرب میں ہے،

و دلت الشمس تدلک دلوکا غربت آفتاب کا دلوک ہوا، یعنی وہ غروب ہوا، اور کہا گیا
وقبل اصفرت ومالت للغروب، و ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا
فی التنزیل العزیز "اقیم الصلوٰۃ لدلوک اور غروب کے لئے جھک گیا، اور قرآن میں ہے کہ
الشمس الی غسق الیل" وقد دلت "دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز
زالت عن کبد السماء..... و کھڑی کر، اور آفتاب کو دلوک ہوا، یعنی وہ آسمان
قال الفراء عن ابن عباس فی دلوک کے بیچ سے ہٹ گیا..... اور فرما نے کہا
الشمس انه زوالها الظہر قال ویرأی کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ دلوک شمس
العرب یذہبون بالدلوک الم کے معنی، ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں
غیاب الشمس، قال الشاعر، اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک

سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے
هذا مقام قد می رباح ذببت حتی دلت رباح "یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں
یعنی الشمس، قال ابو منصور وقد مرینا قدم جے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی
عن ابن مسعود انه قال دلوک الشمس حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج پہلے سے جھک گیا
غروبھا وروی ابن ہاشم عن الانفس ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے روایت
انه قال دلوک الشمس من زوالها الی کی ہے، کہ "دلوک شمس آفتاب کا غروب ہے" اور

ابن ہانی نے اخش سے نقل کیا کہ "دلوک شمسِ زوال
سے غروب تک ہے" اور زواج نے کہا کہ دلوک
شمسِ ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور
اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور
یہ بھی اس کا دلوک ہے " محاورہ میں کہا جاتا ہے
کہ دلکت براج و براج یعنی آفتاب زوال کیلئے
جھک گیا، یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اس کو زور
چاہے تو اس کی کرن کی شدت کو توڑنے کیلئے
اس کو آنکھ پتھیلی رکھنے کی ضرورت ہو۔۔۔
تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں
دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائیگا کہ دلوک
کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لئے آفتاب
کو "دالک" کہتے ہیں، جب وہ دوپہر کو جھک جائے
اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے، تب بھی اسکو
"دالک" کہتے ہیں، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں
وہ جھک جاتا ہے، فرار نے کہا کہ اس قولِ شاعر
یا محاورہ میں جو براج کا لفظ ہے یہ رام کی جمع ہے
جس کے معنی پتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب
ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر پتھیلی رکھ کر دیکھتا ہو

کہہ افتاب اچھی عروبہ ہوا یا نکلتا،

شعراے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر پتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے، عجاج کہتا ہے،

والشمس قد کادت تصحون دنفا ادفعها بالراح کی ترحلفنا

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر ڈبلا ہو جائے، میں اسکو پتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اسکا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الہا سے ہٹتا ہے، دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے، جب وہ مقابل کرہ سمت نظر سے ہٹتا ہے، اور مغرب طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شیعاعون کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر پتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت، لاقی ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے، ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں، بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزرا تھا یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اول اس میلان پر جو سمت الہا سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے، اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

اقبل الصلوة لئلا تلوک الشمس، آفتاب کے دلوک کے وقت نماز پکڑی کر،

لہ یہ شعر تغیر طبری بن ابی نضر نے مذکورہ کے تحت میں، اور سان العرب میں ولف اور زحمت کے تحت میں مذکور ہے

سے مراد تین نمازین ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الہام سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے، اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور فجر کی نمازین مراد ہیں، اس طرح اس آیت پاک سے جو سورہ اسرار میں واقع ہے، اوقات پنجگانہ میں قیامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے،

اوقات نماز کا ایک اور راز | اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے، اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے، جہن بدریہ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر ہے، اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے، پھر یہ ترتیب اور چاروں نمازون کا ظہر کے بعد، عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشا، یہ چار نمازین تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشا سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فاصلہ رکھتی ہے، اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً قدر فاصلہ ہے، چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشا تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک بجے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے، اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے، غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب، اور مغرب سے عشا تک مسلسل نمازین ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے، اور پھر انسانی کارناموں کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا، جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی،

لے تفسیر دن میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہیں نمازون کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے، حضرت ابن مسعود دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس زوال آفتاب مراد لیتے ہیں، اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشا سمجھتے ہیں، اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشا اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے، اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنجگانہ کو بتاتی ہے،

سلف میرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ،

اوقات پہنچانہ کی ایک اور آیت
سورہ اسراء کی آیت کی طرح سورہ طہ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پہنچانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ
قَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ الْيَلِّ فَسَبِّحْ
وَأَطْرَافَ النَّهَارِ (طہ-۸)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ، اور دن کے کناروں

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے، اور دن کے کناروں میں نظر اور مغرب ہے،

اطراف النہار کی تفسیر | یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ "اطراف" کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح اور شام یا تین ہیں اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر اور شام، پہلی شق لیجائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے، اور نظر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کیجائے تو گو نظر آ جاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے،

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف کو جمع ہے مگر کلام عرب میں تشبیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین "دو مشرق" اور "دو مغرب" ہے، دوسری جگہ انھیں کو "مشرق" اور "مغرب" کہا گیا ہے، سورہ تحریم میں ہے فَقَدْ

صَفَّتْ قُلُوبُنَا لَكُمْ (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلوب ہونگے، قلوب (بصیغہ جمع) نہیں ہو سکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے، اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بنا

پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں، یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک، اور دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے بیان مراد ہیں صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ نظر ہے، اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری

کنارہ عصر یا مغرب ہو، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبِ آفتاب کے اندر متعلق موجود ہے، اس لئے مستعین ہو گیا کہ
بیان اس سے مراد مغرب ہو،

ایک اور طریقہ ثبوت اگر ہم قرآنِ پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے
ہیں مثلاً

۱- اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ (سجہ - ۹) زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر،

یہ ظہر کی نماز ہے،

۲- وَقَبْلَ الْغُرُوبِ (رق - ۳) اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو،

وَإِذْ كُنَّا نَسْفَحُكَ يُرْسِدُكَ مَبْرُكَةً وَأَصْلًا (دہر - ۲) اور اپنے پروردگار کا نام لوحِ کو اور عصر کو،

یہ عصر کی نماز ہوئی، اور اسی کو وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى (بقرہ - ۳۱) (بیچ کی نماز) سورہ بقرہ میں اسلئے

کہا گیا ہے، کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے،

۳- وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (ہود - ۱۰) اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں

میں نماز کھڑی کر،

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے،

۴- سورہ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زمانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو،

مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ (نور - ۸) صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے نماز صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے،

۵- وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اور عشا کی نماز کے بعد،

اس کے رو سے مسلمانوں کو عشا کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے، کسی کے

مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشا کا عملی ثبوت ہے، اور یہی پانچوں اوقات نماز

لے ۱۱ اصل الوقت
بعد العصر الى الفجر
یعنی دوپہر کا وقت
مکان العشا

نماز چنگا نہ احادیث
دست میں

تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لیکر آئے اسکی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے

بہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرمادی، اور خود عمل فرما کر، اور اپنے تمام پیروں سے اس کی تعمیل کر دیا اگر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک و شبہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرمادی، اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک و قوی و علی تو اتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہئے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہئے، کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی اپنے زبانی تشریح فرمائی، صحابہ کو تلقین کی، اور علم نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گزری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم دس تین متصل دن بس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے، یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں مختلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا، مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلان نماز کی آوازیں بلند ہوتی اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروان محمدی جہاں بھی رہے، اور جہاں بھی پہنچے، اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشیاء و سفر و حضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے، کیا ایسی مستمر علی الاعلان امتواتر اور دائمی چیز میں کسی کو شک واقع ہو سکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار اور یہ تاکید بلیغ اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریق عبادت بعد کے پیروں کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہو گیا، خاتم الانبیاء کی شریعت آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیونکہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت اگر اسکی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروان محمدی میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری

اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایت متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں، نماز وہ فریضہ الہی ہے جس کی فرضیت
خمشہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے تقرب خاص سے ممتاز ہوئے
حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں، جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں قرآن
پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ مَنْ جَاءَ بِحَسَنَةٍ فَلَهُ عَشْرٌ مِثْلُهَا (انعام - ۲۰) یعنی
جو ایک نیکی کریگا، اس کو دس گونہ ثواب ملیگا، اس لئے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں،
نماز کی فرضیت کے بعد فرشتہ الہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقات خمشہ کی تعلیم کی اور
ہر وقت کی ابتداء اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر علامہ جزیری یقین کیلئے اور وہی آپ نے اپنے پیروں کو بتایا اور
اس پر ان سے عمل کرایا،

چنانچہ آپ نے شیوع اسلام کے بعد ہر جگہ احکام شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے، تو
ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمت اقدس میں اگر عرض کی یا رسول اللہ
آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، کیا یہ سچ ہے، فرمایا ہاں سچ ہے، عرض کی
کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں!
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انھوں نے میری امامت کی، تو میں نے
اُن کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک
دو، تین چار پانچ گنتے جاتے تھے، ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی
صاف شفاف نہر جاری ہو، اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر کچھ مہل سکتا
ہے؟ سب نے عرض کی نہیں، نہیں، فرمایا تو یہی مثال پانچون وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے

۱۔ بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ، کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسراء ۲۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوٰۃ الخ،
۳۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ۴۔ صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ۵۔ ۲۵ مصر،
۶۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا باب اوقات الصلوٰۃ الخ،

اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے، اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہو جب تک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب دروڑ پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو، تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے،

ابو بزرہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں ساٹھ سے سو اٹھین تک قرات کرتے تھے، اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے، اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یا د نہیں رہا، او عشاء کو تنہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے، حضرت جابرؓ دوسرے صحابی نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے، اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا، اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت، اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے، صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۃ فاتحہ کیسا تھے سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی، مغرب میں سورۃ المرسلات پڑھی اور کبھی سورہ طور پڑھی عثمان بن اذہار انشقت اور واثین والزینون قرات کی ہے، اور صبح میں سورہ طور پڑھی ہے،

اس قسم کی اوریسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام امتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواریخ دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے،

تہجد افضل ہے لیکن کیوں؟ ان نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے

صلوٰۃ صبح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ خمس کفارة صلوٰۃ صبح مسلم باب اوقات الصلوٰۃ خمس، صلوٰۃ صبح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال صلوٰۃ صبح بخاری باب وقت العشاء اربعہ الناس او ثلثہ او اثنی عشر، ایضا باب القراءۃ فی اللیل والعصر والمغرب العشاء والفجر، بروایات متعددہ، صلوٰۃ چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی، اسلئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے،

نفل ہوگی، چنانچہ پدی آیت یہ ہے

أَقِمِ الصَّلَاةَ لَدُلُوكَ الشَّمْسِ إِلَى الْغَمَسِ نماز کو اقامت کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (نہر عصر
الْبَلَدِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قرأت
مَشْهُودًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَمَجِّدْ بِهِ قائم کر اب شکر صبح کی قرأت میں حضور ہوتا ہے،
نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ)
مَقَامًا مَّحْمُودًا، (اسراع - ۹) زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجکو تیرا رب قابل تعریف مقام

غور کرو کہ جب تک اوقات مقررہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جاسکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ بیون والا پھول بھی تک غنیمت کی طرح ورق بر ورق تھا جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی، اور حکم آیا کہ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ، یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو، اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامت صلوٰۃ کے اوقات بچکانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز کی تجدید کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تجدید نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی،

بعد انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہو سکتا، جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہو، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہو سکتا، جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا، اور یہ عام اجازت دیدی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کرے نماز ادا کرے، تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا، اور نمازیوں کی وحدت صورتی قائم نہ رہتی

لے صحیح مسلم جلد اول باب وجوب قراۃ الفاتحہ، حدیث اربعہ، فصل فانکب لرفعل، نیز دیکھو فتح الباری جلد اول ص ۳۹۳،

بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچم، کوئی اور اور کوئی دکن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز نشان بن جاتا، اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لگائی ہے، صائبی (ستارہ پرست) قطب شاہی کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے، آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بیت کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شاہی تو میں شرق کی طرف رخ کرتی تھیں، یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ ایسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا، شاہی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل اور حضرت یعقوب کا یہ سب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہان عبادت کرنا چاہتے تھے، اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل" بنا لیتے تھے، قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے، تو حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں،

وَأَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ (یوسف ۹) اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرو اور نماز کھڑی کرو،
بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر ہم تسلیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقوعوں پر آیا ہے، حضرت داؤد کے زبور میں ہے:-

”لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا، اور تجھ سے

ڈر کر تیری مقدس ہیكل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا“ (۵-۷)

سلاطین اول میں ہے:-

۱۔ الروایۃ المنطقیۃ لابن تیمیہؒ ۲۔ یہ تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" میں ہیں،

۳۔ سفر تکوین باب ۱۲-۸-۱۳-۴-۲۸-۱۶-۱۹-۲۱-۱۳،

”جب تیرا گروہ ٹرائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہاں کہیں تو انہیں
 بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور
 اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لئے بنایا۔ (۷-۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے :-

”اور اس زمین کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادون کو دی، اور اس شہر کو طر
 جسے تو نے چُن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا ہے“ (۸-۴۵)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی، اس لئے اہل عرب کا
 قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے،

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيًا فَاسْتَبِقُوا

اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، چاہے وہ منہ

الْحَنَبَاءِ، (یعنی ۸-۱۰)

پھیرتی ہو تو اسے مسلمانوں کی طرف دوڑو،

ادھر کے بیان سے واضح ہوا ہو گا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست،
 یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب
 کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو، اور صابئی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست
 اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحّدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے
 تھے، ابراہیمی قوموں میں اس قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ
 کعبہ)، پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحقؑ اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری
 مسجد کے ستوئی حضرت اسماعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے، جنہوں نے اس کو قبلہ بنا لیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے، کہ کعبہ اور بیت المقدس
 دونوں سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس

برقیہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے کہ وہی انیسے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا، لیکن آپ کی طبی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیم) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص ہمت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ بے سمت ہے، اور سب سمتیں اسی کی ہیں،

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ قَاۤیِنًا تَوَلَّوْا۟
اور خدا ہی کے لئے ہے، پورب اور پچم، توجہ صر
فَلَمْ يَجْعَلْ لِّلّٰهِ اِلٰهًا اِلَّا اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلَیْمٌ
رخ کروادھری خدا کا منہ ہے، بیشک اللہ بڑی
گنجائش اور وسعت والا، اور بڑے علم والا ہے،
(بقرہ ۱۴۲-۱۴۱)

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے، اور ہر ہمت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جن سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے،

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ
بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو
عَنْ قِبَلَتِهِمُ التَّوْحٰٓتُ کَاۡنُوۡا عَلَیْہَا
ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا، جس پر وہ
قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ لَا یُکْدِیۡ
تھے، کہہ سکتے کہ پورب اور پچم دونوں خدا کے ہیں
مِنْ لِّیۡسَاءٍ اِلٰی حَرٰٓٔ مُّسْتَقِیۡمٍ، (بقرہ ۱۴۰)
وہ جگہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے،

یہود جن کو سب سے زیادہ یہ اعتراض تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا،
لَیْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
نیک ہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی

وَالْغُرَبَاءُ وَلَكِنِ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَ
 وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
 وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
 وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ
 وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ
 إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ
 وَالضَّرَآءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ
 الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

طرف پھر والبتہ کی یہ ہے کہ خدا، قیامت وشتون
 کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت
 کو اس کی محبت کے بارجود (یا خدا کی محبت پر)
 رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں،
 سائلوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں اس کے
 اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور (نیک یہ ہے)
 جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف
 اور جنگ میں صبر کرتے ہیں وہ ہیں جو سچے
 (یعنی) ہوئے اور یہی پرہیزگار ہیں،

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے قبلہ یعنی وہ سمت
 یا جگہ جس کا رخ کیا جائے عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہیں ہے لیکن چونکہ نمازوں میں اس کے
 نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لئے سلسلہ میں خانہ کعبہ کے
 قبلہ بنانے کا حکم ہوا،

قَوْلَ رَبِّهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
 حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ
 پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر
 اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو،

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہیں، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا جس کے چاروں
 طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جاسکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال سب ہر ایک وقت
 مسلمانانِ عالم کا قبلہ بن، جس سے ایک لطیف رمزیہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی
 یہ جہت ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز مثلاً آفتاب

یا قطب شمالی وغیرہ کی مسجدیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا، اس کا کلیۃً خاتمہ ہو گیا،

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام (مکہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں، اس پر یہ ضرور تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذرا، بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً بت مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر کو اکابر ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا اور دوسری چہرہ خورشید کا مطلع اور بیاض سحر کا دیا چھ تھی، دین توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، کہ ستارہ پرستی کے ابطال کیلئے ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے،

۲۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مزاج سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا تھا، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اسکے لئے ضرور تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے متنازعہ کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدہ سے وہ سمت متعین لگتی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کی جاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے متعلق وجہ ترویج کا پیدا کرنا ضروری تھا، اور اس تزیج سے دین توحید کا دین شرک بن جانا

لازمی تھا،

۳۔ اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی ناز محفوظ رہے، حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدوں میں سے اُن کی نسل نے دُومرزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی،

(۴) اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا، جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا، اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے،

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي
بِبَكَّةَ مُبَارَكًا، (ال عمران - ۱۰)

بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لئے
(خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔

وَإِذْ يَبْعَثُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنْ
الْبَيْتِ وَاِسْمَاعِيْلُ، (بقرہ - ۱۲۵)

اور جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کے کعبے اٹھا
رہے تھے،

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے،

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ
أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ،

اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ
کا قبلہ ہونا حق ہے، (اور وہ) اُن کے پروردگار
(بقرہ - ۱۷۷)

پولوس (پال) ایک خطین جو کلیتون کے نام سے لکھا ہے،

”کہ یہ لکھا ہے ابراہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے

(دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا،

اور جو آزاد سے تھا (اسحق) سو وعدہ کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام صہبی بن، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے، اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے، اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں جوڑا پر اور پر کا یروشلم آزاد ہے، (گلیتون کے نام ۲۲-۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو گا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں، "اب کے یروشلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا جو اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا، جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں، اور راسخہ میں سینا پڑتا تھا، اُس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متواتر ہو گئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک، ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا بیان ذکر نہیں ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا، جس کا ذکر سورہ اسراء کی آیتوں میں ہے، اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو "سینا" پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا،

سراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال

بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بنایا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست، اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتداء کا اعلان تھا، جیسا

کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں سلسلہ معراج

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا

مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى

الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ. (بنی اسرائیل - ۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت

مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (میت المقدس)

تک لے گیا، جس کی چاروں طرف ہم نے برکت دی

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ میت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ

ہونے کی شان باقی نہیں رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی، جبکہ تعلق عہد اسماعیلی سے تھا

(یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے،

وَإِذْ أَوْثَقْنَا بِرَبِّهِمْ سُرُجَهُ بِكَلِمَاتٍ

فَأَتَمَّمْتُمْ قَوْلَ آتِي جَاءَ عَلَيْكَ لِلنَّاسِ

إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا

يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ، وَإِذْ جَعَلْنَا

الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَإِمَامًا وَنَحْنُ

مِنَ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا

إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا

بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ

وَالسُّجُودِ.

اور جب خدا نے چند باتوں میں ابراہیمؑ کو آزمایا

تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا، خدا نے کہا میں

تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، (ابراہیمؑ

نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا

میرا عہد ظالموں کو شمالی نہ ہوگا، اور جب ہم نے

گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن

بنایا، اور تم ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز

پڑھنے کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ

سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے

اور کھڑے ہونے والے بنائے، اور رکوع کرنے والے اور

غرض یہ رجز الہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا، جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، اور جو دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور زمین پر خلیفہ اللہ کا عکس تھا، اس لئے حکم ہوا،

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ ۱۴۴-۱۴۵) کر،

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی جگہ کھڑا ہو کر فریضہ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا،

فَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّخِذُوا اللَّهَ (بقرہ ۱۴۴-۱۴۵) پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے،

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و معبود نہیں، نہ شرکون، بت پرستوں، اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر بالفرض ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے، اور صرف نصاب باقی رہ جائے، تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہو، گھسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جاسکتا ہے، یہ باتیں

ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی تھیں قطعی تردید کرتی ہیں، اور یہی اس باب میں دین محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے،

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابرہہی کے پیرو ہونے کا علی ثبوت، دنیا کے قدیم موجدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار، اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا، اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہو جانور کھائے، وہ مسلمان ہے اگر خیال کے پر پر داز سے اڑ کر اور فضاے آسمانی کی نیگیوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئیگا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صفت بستہ اور سر بسجود ہیں،

رکعتوں کی تعداد ایک، قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشا کے وقت چار چار، اور مغرب میں تین ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی، اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیونکہ مصیبت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہو سکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بد دل بنا دے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سکند میں تمام ہو جاتی، اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بدلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبرا جاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں،

کہہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی، اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپکرو نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے کہ معظمہ میں ہر نماز صرف

دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعتیں کر لیں۔ لیکن مسافر کے لئے وہی دو رکعتیں قائم رہیں، کیونکہ اسکی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لئے دو اور بحالت خوف ایک۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ مغرب اور صبح کی نماز میں قیام و سفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں، اور صبح میں خود دو رکعتیں ہیں، ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ائمہ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے: ”مغرب میں تین اسلئے ہے کہ وہ دن کا وتر ہے، اور صبح میں دو اسلئے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرائت لمبی کر دی گئی ہو۔“

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گزر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی مانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا، مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کریں، اسی لئے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رکھی گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے، یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع و خشوع اور تاشکاف و تضرع ہو، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زور و جبر ہے، طاق نہیں، بنا برین توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت

۱۔ صحیح بخاری باب الحجۃ و صحیح مسلم صلوۃ المسافر و مسند ابن خلیل جلد ۶ صفحہ ۲۴۱ وابن خزیمہ وابن حبان اور البیہقی ریح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۳، ۲۔ صحیح مسلم صلوۃ المسافر، ۳۔ مسند احمد بن حنبل ۶-۲۴۱، ۴۔ صحیح مسلم النہی عن الصلوۃ فی الاوقات الثلث، ۵۔ عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے، یعنی تین جو رات کی وتر ہے،

ہوتی ہیں، نیز نماز کے شروع و ختم کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا، جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہوتا
اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی، اور چونکہ آفتاب کا کمال زوال انحطاط جسکو غروب کہتے ہیں اسی
وقت ہوتا ہے، اسلئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اُس حدیث کے
الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے،

أَوْ تَرَوِیَا اِهْلَ الْقُرْآنَ فَاِنَّ اللّٰهَ وَتَرَ
اسے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو کیونکہ خدا بھی

یحبُّ الوتر۔ (ابوداؤد) وتر (طاق) اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے،

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام اور سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ
بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزون ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر
اور مجسم نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزون ہے، اور قرآن مجید میں
اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے،

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (رَبِّ السَّجْدَةِ ۱۰)

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصلی کیفیت
کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کر دیجائے، اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی
جائیں، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازون کی ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت
فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لیکر تو آیتوں تک قرأت کرتے تھے، اور اسی نسبت سے
رکوع و سجدہ بھی ہوتا تھا،

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور تمام مسلمان اس
تواتر پر بلا استثناء عمل بھی ہیں، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نمازِ خوت سے ظاہر ہوتا ہے، جہاں

لے صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءة، لے مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعداد الارقان الصلوٰۃ وتخفيفها فی تمام

یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے، اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں، اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک، اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں، جب نماز خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں، تو اصل رکعتیں چار ہونگی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نماز قصر کی آیات سورہ نسا کے پندرہویں رکوع میں ہیں،

نماز کے آداب باطنی قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لئے متعدد نقطہ آئے ہیں، مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح، اور ذکر الہی، اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات، و آداب کو ظاہر کرتے ہیں، نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو، اور روح میں استہزار پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گلی بے رنگ اور شراب بے کیفیت سے زیادہ نہ ہوگی،

اقامت صلوٰۃ، نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک میں جا بجا "اقامت صلوٰۃ" (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان و سنن کیساتھ ادا کرنے کے ہیں، چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے، فَإِذَا أَطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ "پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجالایا جائے اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع طوفاً رہنا چاہئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے،

قنوت، نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ، (بقرہ-۳۱) اور نبی کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر دیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ کیسوی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں: چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے، اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے، کیونکہ نماز میں ذکر و قرأت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے، اگر ان میں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائیگی۔

خشوع، تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے،

الَّذِينَ هُمْ فِي سَلَا تَصْعَخُ اشْعُونَ" (وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں

(مومنون-۱) خشوع و خضوع کرتے ہیں،

خشوع کے نفوی معنی یہ ہیں، بدن جھکا ہونا، آواز نپست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا، (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکنتی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی،

تبثّل، تبثّل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں، اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے، مگر قرآن پاک میں جان اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورہ مزمل

مین ہے،

يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ قُلْ قَدْ أَيْلَ إِلَّا قَلِيلًا
لِّصَفَةِ أَوْ الْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زَحْ
عَلَيْهِ وَرَسُولِ الْقُرْآنِ تَزِيلًا إِنَّا
سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا إِنَّ
نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ
قِيلًا إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا
وَاذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ
تَتَّبِعِلَّاهُ (منزل-۱)

لے کئی اور صفے والے، تھوڑی دیر کے سوا تمام
رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدمی رات یا اس سے کچھ کم
میں اور اس میں قرآن ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر
ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں، بیشک
رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے
اور مؤثر ہوتا ہے، تیرے لئے دن کو بڑی
فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز
سے کٹ کر اُس کی طرف ہو جا،

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے
تمام خیالات نکل جانے چاہئیں، صحیح مسلم میں حضرت عمر بن عبدہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلی
نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی ثنا
کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جسکا وہ سزاوار ہے، اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا،
(و فرغ قلبہ لله) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی مان نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو،
یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے،

تَقْصِرُ، تَقْصِرُ کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں، (وَسَلِّ)
العرب نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عاجز و انکاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے
ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا،

صحیح مسلم اول باب الاوقات التي نهي عن الصلوة فيها،

ادْعُوا سَبْكَكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ط
تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کیساتھ اور وہی

(اعراف - ۷) آواز سے پکارو،

اخلاص، نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں، بلکہ ریاء اور نمائش ہوگی، اور بعض اہل حق کے نزد شرک لازم آئیگا، فرمایا،

وَأَقِمُوا وَحُبُّكُمْ غِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوا
اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا

مخلصین لہ الدین ط (اعراف - ۳) کو اخلاص کے ساتھ پکارو،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے،
فکر "نماز" خدا کی یاد کے لئے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو، تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی، اسیلئے فرمایا
أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي، (طہ - ۱) میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

ظاہر ہے کہ "یاد" صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی محبت اور
قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے، اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے،

فہم قوت ہم پر نماز میں جو کچھ پڑھا جائے، اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر بے پروائی کی
وجہ سے منون کی طرف دل متوجہ نہ ہوا، تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لئے نشہ کی حالت میں نماز
پڑھنے کی مانعت لگتی ہے، کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، فرمایا،

لَا تَشْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى
نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو،

تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ، (نساء - ۷) یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے،
اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی مانعت فرمائی ہے، کہ اس میں بھی انسان فہم

اور تدبیر سے ماری ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں جب تم پر
نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپکو
برا بھلا کہنے لگو۔ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیے، تاکہ وہ جو کہتا
ہے وہ سمجھے،" حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح
نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے، اس کو سمجھتا بھی ہو یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن
وہ مان کے پیٹ سے پیدا ہوا۔"

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط
سے غفلت برتنا، نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت
ہے، اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں،

قَوْلُكَ لِلَّهِ صَلَّيْنَا الَّذِيْنَ هُمْ عَنْكَ
صَلَّا تَقْصِرُ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ
يُؤَاؤُونَ، (ماعون-۱)

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکا رہو، نمازی ہونے کے
باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں، کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ، اور
اداسے ارکان میں اعتدال وغیرہ، اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تقصیر و زاری، اور فہم و
تدبر وغیرہ ضروری ہیں، ان سے نماز میں تغافل برتا جائے،

اسے مسلم کتاب الصلوٰۃ باب المرنعس فی صلاۃ جلد ۱ صفحہ ۲۹۳ بخاری و ابوداؤد و مسند احمد بن اسلم مستدرک زرغیب و
ترغیب ماقفا منذری جلد اول ص ۱۳۷ سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہیے، اور چاہئے کہ نماز میں
جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں ان کے معنی ذہن نشین کر لیں، اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ
وہ تھوڑی توجہ کرے،

نازین نظر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کے خلاف ہے، اس سے انسان کی توجہ ہٹتی، اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نازین ادھر اُدھر نہ دیکھا کرو، کیا تمہیں یہ اور نہیں کہ تمہاری نظر پھر واپس نہ آسکے؟ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نازین دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے، طہرانی مین ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "جب تم مین سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو، تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نازین منہ پھیر کر ادھر اُدھر نہ دیکھو، کیونکہ جب تک تم نازین ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو، مسند بزار مین ہے کہ جب بندہ نازین ادھر اُدھر دیکھتا ہے، تو خدا فرماتا ہے تو کہہ دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھتا ہے، دوسری دفعہ بھی خدا ہی فرماتا ہے، پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے، ایک دفعہ آپ نے فرمایا "سب سے بڑا پورہ وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے، صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ نماز کی چوری کیا ہے، فرمایا "رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا، اور شروع نہ ہونا، ایک دفعہ آپ نے نماز سے

[illegible]

فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ "اے فلان تو خدا سے نہیں ڈرتا، کس طرح نماز پڑھتا ہے جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے، پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے؟" صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کیلئے نماز پڑھتا ہے؟ نماز کی حالت میں تھوکتا اور غصہ سانسے تھوکتا اور کبے خلاف ہے، آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے، تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھو کو؟" دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھو کے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے؟" مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے؟"

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں، ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ، بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پرسکون، اور وقار طاری ہو، اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پرسکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اُس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے اُن سے بھی فراغت کر لیجائے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہوا اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو، اسی طرح اگر استنجایا قضاے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لیجائے تب نماز پڑھی جائے۔

۱۔ مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اول ص ۲۳۲ علی شرط مسلم، ۲۔ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامرتین الصلوٰۃ، ۳۔ صحیح مسلم کتاب النکاح باب النبی عن البصاق فیہا وحاکم فی المستدرک والبوداؤد ص ۵۷ صحیح بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ والمساجد، ۴۔ ایضاً باب النبی عن البصاق فیہا، ۵۔ صحیح مسلم باب استتباب التیان الصلوٰۃ بوقار، ۶۔ صحیح بخاری و مسلم والبوداؤد و ترمذی باب کراہۃ الصلوٰۃ بحضرة الطعام،

۷۔ صحیح مسلم والبوداؤد و موطا سے امام مالک و ترمذی وحاکم فی الصلوٰۃ،

آغا اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے لیکن مدینہ اگر یہ اجازت
منسوخ ہو گئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ نماز میں سلام
کیا، اور جب اپنے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انھوں نے اس کا ذکر کیا، فرمایا،

إِنَّ فِي الصَّلَاةِ لَشُغْلًا، نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے،

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے
اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی،
پھر فرمایا "اسکے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس کو ابو جہم (تاجر کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انجانی
سادہ چادر لے آؤ، اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک نقش پردہ لٹکا دیا تھا اپنے
نماز پڑھی تو خیالات میں کیسوی نہ رہی، اپنے اس کو تروا دیا،

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اہول تدبیر نظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جنہیں نسبت سکون میں
ہوتا ہو اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہئے، تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی
ہے، اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا
کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے، اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو،

فَإِنَّ الصَّلَاةَ مَشْهُودَةٌ مَحْضُورَةٌ، کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے،

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم
ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان
کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ "جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم خدا کو نہیں
لے صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوة ۱۱۱ صحیح مسلم باب کراہۃ الصلوة فی ثوب لہا اعلام، ۱۱۲ صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس
۱۱۳ صحیح مسلم باب انہی عن الاوقات الثلث،

دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور خیم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے چکیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کلی چل رہی ہے، یا ہانڈی ابل رہی ہے۔ رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں، تو دعا کرتے، اپنے فرمایا کہ نماز دو دو رکعت کر کے ہے، اور ہر دوسری رکعت میں تہجد ہے، اور تفرغ و رازی ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے، اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا، تو اُس کی نماز ناقص رہتی۔

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرات کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے ٹھل انداز نہ ہو۔

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مری رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو، کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لیکر اترتا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصل کیفیت کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ

۱۔ صحیح بخاری کتاب الایمان، ۲۔ ترمذی و ابوداؤد و ابوالکاسم فی الصلوٰۃ، ۳۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۳،
۴۔ ابوداؤد باب صلوٰۃ النہار و ترمذی باب اجار فی التخت فی الصلوٰۃ ص ۵ مطبوعہ دہلی، ۵۔ ابوداؤد صلوٰۃ اللیل،
۶۔ مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۱۲۲ عن ابی ایوب،

انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کیساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے،

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ
بِهَا وَهُمْ عَلَى صَلَاحٍ يُخَالِفُونَ،

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ
قرآن کو مانتے ہیں، اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت

کرتے ہیں، (النعام - ۱۱)

نماز کی اس نگہداشت، اور محافظت کے دو معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو

اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت،

نماز کے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے

اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آئینہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر تمدن ملک کو جس کو پہننے اور بٹنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ مہیا پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مذہب و تمدن ہو جاتا ہے، تمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنادیتا ہے، اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بن جاتا ہے،

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز سر روشنی کا خیال ہے، انسان کا شرم چلا

کی نگہداشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب

ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج

کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر تنگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اُس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں آیت نازل ہوئی،

خُذُوا زِينَتَكُمْ مَعَكُمْ كُلُّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳) ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

مردوں کے لئے کم از کم سات سے گھٹے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لیکر پاؤں تک چھپنا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہان جہان اسلام گیا، وہاں کے بنیہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاسکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف تمدن قومین ازیب نے زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بھیجی پراثر آتی ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز کی بھی اصلاح کرتی ہے، اور ان تمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی،

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اُقرآن کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اُس میں یہ حکم تھا،
وَرَبَّائِكُمْ فَطَيَّرُوا (مذثر ۱) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو،

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان

طہارت

کا بدن اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور لوگوں سے پاک ہون، اہل عجب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہ اس کو مارنے کو دوڑے، اپنے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کیلئے یہ موزون نہیں ہے، اور صحابہ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گزرے تو فرمایا کہ اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا، غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجاء، بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں،

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا ہمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّخِذُوا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ،
اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں
کہ وہ پاک و صاف رہیں، اور اللہ تعالیٰ پاک
وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے،
(توبہ۔ ۱۳)

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے؟

۳۔ نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا

کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے تھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنجوقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے،

اہل عرب اور خصوصاً بدو و انتون کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہتی اور بدنہائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا۔

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے، اُن کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے، اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے، تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جبہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

غسل یوم الجمعة واجب علی کل جمہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری

معتلہ، (بخاری کتاب الجمعة) ہے،

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو لٹنا، اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز مکمل ہی نہیں فرمایا،

وَأِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا (مائدہ ۶: ۴۸) اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

پابندی وقت

۴۔ انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اُس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہو اور اس طرح اُس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اُس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات جو مقرر ہیں، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، اُن کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں، اور نماز کے اوقات اُن کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا اُن کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی کا قول ہے،

الصلوۃ مکیال فمن اوفى اوفى نماز ایک پیمانہ ہے، جس نے اس سے پورا ناپا، اس کو

بہ ومن طفت فقد علمتم ما للطفین پورا ناپ کر دیا جائیگا، اور جس نے ناپنے میں کمی

کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی منزل معلوم ہے،

اس قول کے جہان اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہو،

اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جاسکتی ہے،

صبح بخیر

۵۔ طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے

بیدار ہونا جن درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی

نہیں کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سونا نہ جائیگا، صبح کو وقت پر اٹھ نہ سکیں، اسی لئے آنحضرت

ﷺ کے اعمال مندوبات الصلوۃ، جلد چارم ص ۲۳ بحوالہ مصنف عبدالرزاق،

صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز عشا کے بعد بے کار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے، تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور صبح خیر مسلمانوں کی عادت ہو جائے، اور صبح کو مؤذن کی پرتاثر آواز:-

الصلوة خیر من النوم سونے سے نماز بہتر ہے

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے،

۶۔ ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم دگمگاتا ہے تو رحمت الہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کھینکے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کا پتہ نہیں، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاتمہ کو بیدار کرتی ہے، اور برائیوں سے بچاتی ہے، اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے،

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے، (عنکبوت، ۵)

۷۔ نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیات الہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعا و مغفرت کا نام ہے اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھودیں، نماز کی حقیقت کی منافی ہیں، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی مانوست نہیں ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا،

لَا تَقْرَأُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى

نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ

لَا تَقْرَأُوا الصَّلَاةَ بِمَا كَرِهَ مِنَ السُّمْرِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ

مذاکات

بشاری

تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ، (نساء - ۷۰) یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو،

مسلمان کی امتیازی نشانی

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گرم کر دین قطعاً پرہیز کر چکا۔
۸۔ مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ نخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے غور کرتے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلاق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جو عکے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے، اور یہ جاہ و فقر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہو سکتی تھی، فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھاپی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی ذریعہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا،

وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُتْلًا ۖ

اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کھلمدی

(نساء - ۲۱) کے ساتھ اٹھتے ہیں،

نیز فرمایا،

وَأَنهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۚ

خضوع و خضوع والوں کے علاوہ نماز سب

(بقرة - ۵) پر گراں ہے،

خصوصاً عشا اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ليس صلاة اثقل على المنافقين من منافعهم على غير دعاء سے زیادہ کوئی نماز

الفجر والعشاء

گران نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم دھابہ کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے۔

مدنیہ اگر نمازین قبلہ کی تبدیلی جان اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے منافقین اور منافقین کی تیسر ہو سکے، اگر معطلہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قابل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدنیہ میں یہود آباد تھے، جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک میں ہے،

وَجَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا اِلٰهًا
لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ
عَلٰى عَقْبَيْهِ ۗ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةٌ
اِلَّا عَلٰى الَّذِیْنَ هَدٰى اللّٰهُ ۚ

اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا
لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی
کرتے ہیں، ان سے الگ کر دیں جو اُسے
پاؤں پھر جائینگے، اور یہ قبلہ گران ہوا لیکن

(بقبرہ ۱۷۰)

ان پر جنکو خدا نے راہ دکھائی،

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہیگی، اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا،
اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے،

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر ٹرنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان

کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نماز میں ہیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے،

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم
انحضر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر

لے بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل صلاة العشاء فی الجماعۃ ۱۷۰ مستدرک حاکم (دلی شریعت) جلد اول ص ۲۱۱، بخاری باب فضل استقبال القبلة

جنگ کی
تصویر

جبوشنہ اذا علوا الشنا یا کبر و او چڑھتا تھا تو کبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو
 اذا هبطوا سبحوا فرضعت الصلوة علی ذالک (ابوداؤد) تسبیح کہتا تھا نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی
 صف بندی، ایک (فسر امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری
 اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوں کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف
 سکھاتی ہے، اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا ظہر کے وقت
 دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت ہلو وعب کی دھچپیوں سے وقت نکال کر
 خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعاؤ زاری کر لینا، صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں
 مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے
 پیدا کریں، اور کام کی ضرورت کے وقت احساس فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کے
 لئے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں، ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لئے شہر کے سب
 مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پر آرام سے پر آرام وقت میں نکلن تھا، مگر اس کے لئے بھی
 دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں، اور
 نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دیگا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مستحکات وقت کے اتفاقات میں اس کے
 لئے کس قدر عمدہ ثابت ہوتی ہے،

داعی تنبیہ
 اور
 بیداری

۱۔ تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے، لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا
 ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی
 ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ، اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں، اس کے
 ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمرین ایک بار ادا کرنا پڑتا
 ہے، اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبیہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے، برخلاف ان کے

نمازوں میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام، قعود، جہر، خفاء، تسبیح و تہلیل، تکبیر و شہدے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے جنہیں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور ہر چیز میں گھٹنہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہتیار اور قلب خفہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تہیہ ہوا کرتا ہے،

۱۱۔ نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، جملہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں، اور باہم ایک دوسرے سے ملین تو ان کی بیگانگی دور ہوگی، ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے، قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے،

وَاتَّقُوا ۖ وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا
مِنَ الْمُتَكِبِّينَ ۚ مَنَ الَّذِينَ بَيْنَ فَرْقَتِهِمَا
وَيَتَّبِعُونَ كَاوَأَشْيَاعًا (سورہ مائدہ - ۴)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو، اور مشرکوں
میں سے نہ بنو، ان میں سے جنہوں نے اپنے دین
میں بھٹ ڈالی، اور بہت سے جتھے ہو گئے،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتنا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی، بیگانگی، تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا،

۱۲۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہو گئے، اور امر اور اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی، اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی،

ابتداءً اسلام میں اصحابِ صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحقِ اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیجا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو

الفت
محبت

غمخواری

ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے،

وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيَمْسُرُونَ زَكَاةَهُمْ
اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے دیا ہے
يَتَّقُونَ، (بقرہ - ۱)

۱۳۔ اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لئے تمام قوموں نے اس کے لئے مختلف اوقات اور
تہوار مقرر کئے ہیں، جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کیا جاتا ہے، ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش
کلبوں، کانفرنسوں، انٹرنیشنلین، اور دوسرے جلسوں، جلوسوں، اور مظاہروں سے کی جاتی ہے لیکن
یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے، وہاں اپنے منفی اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی
ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شہر بانجوری، تھار بازی، چوری، بد نظری
بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں
عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں، اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین
گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی
جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سبب علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے
قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے، اور اجتماعیت
پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہے، چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازین
ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازین مقرر کیں، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہوا
اور مشرکانہ بدیوں اور افلاکی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوت خیر پر رکھی گئی ہو
جج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشا
بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال

اعلامِ عمل کی بنیاد پر قائم ہے،

۱۴۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمہ گیری کے باوجود قنن، اور تہجد کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں، تو سکونِ اطمینان، عیش و راحت، اور پکپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چھ اٹھے، اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الہی میں شمار کیا گیا کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم میں نیمرنگی پیدا ہوتی ہے، اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لمحہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو نظر پر اگر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی، اور عصر پہنچ کر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازین خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشا پر جا کر ختم ہوئی، اب نیند آگئی، اور صبح تک بیخبری رہی، اٹھے تو دعاؤں کے اقتراح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دو تہجد جو جہانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے، وہ اس روحانی "انٹرول" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح اور نشت و برخواست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کر لی،

کاموں کا
تنوع

۱۵۔ انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور موانعت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری، اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام میں اس خلقت کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن میں کئی دفعہ

تربیت

نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بار سے عمدہ برآہونے کے لئے انسان میں استقلال، موافقت اور مدارا شرط ہے، اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، اس لئے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں کہا،

الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَأَائُونَ (معارج: ۱) وہ جو اپنی نماز مداومت کیساتھ ادا کرتے ہیں،
انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

احبُّ الی اللہ اذومہ وان محبوب ترین خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ

قل، (ابوداؤد باب ما یومیہ من فی الصلوٰۃ) کیا جائے گو وہ کم ہو،

۱۶۔ کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی علی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی علی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صفت بہ صفت کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ "جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے"۔

۱۷۔ یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درگاہ ہے، یہاں امیر و غریب، کائے گور سے، رومی حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور

لے صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسوئۃ الصفوف عن الاقامۃ وبنی ہا و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسوئۃ الصفوف،

ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگون ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لئے حسب نسب، نسل و خاندان، رنگ، روپ، قومیت اور جنسیت، عمدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدرا، اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں، اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درگاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

۱۸۔ جماعت کی سلامتی بغیر ایک مقررہ اطاعت امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کے اندر اکبر کی آواز قوم کے کاوان کیلئے بانگ درا اور صدا ہے جس ثابت ہو،

اطاعت امام کے لئے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے، جس کی تعلیم مقتدیون کو نماز میں ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاقِ صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے، نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لئے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نماز بیگانہ اور مجسمہ عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے اقتساب اس پر عمل پیرا ہونے اور اس سے اثر پذیر ہونے کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزون ہیں جو ایک عبادت اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا، چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ

مرکزی اطاعت

کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا، اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیان کیں، احادیث میں بھی اس زمانہ کی طرت خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے جس میں اگر وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کر گئے ۱۹۔ نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے، اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرار) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہیں انھیں کو قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے انھیں کمسن رضائی کو ان کا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے،

روزانہ کی
مجلس عمومی

۲۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جائیں، اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے سے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسب شہادت کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا،

ان تمام امور کو سامنے رکھتے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار، اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز، اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح

آج ہر طبقہ کا افتتاح اُس کے نصب العین کے اظہار و تعین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے اُن کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اُس کے تابع اور اسی کے زیرِ نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارہ تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ، اور وہی مسجد تھا،

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا، اور اختلافات باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرِ لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انھیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبری، اور وحدت و توت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں، اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیادِ امامت ہے، نہ زندگی ہے، اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا،

الجهاد الذي بيننا وبينهم الصلوة فمن تركها

ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز

نقد کفر، (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ہے، تو جس نے اسکو چھوڑا، اُس نے کفر کا کام کیا،

کہ نسا از کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شرابِ بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اُس سے رخت ہو جاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے، اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے،

عرب کی روحانی | وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی
کا یا پلٹ وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے
ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی

روح ربانی تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ذوق کیا ہوا؟
 اس عبادت الہی اور اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز
 مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اُس کے دل کو اس لذت
 کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا
 اُس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں، اس کی روح یاد الہی کی تڑپ اور ذکر الہی
 کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی،

دل را کہ مردہ بود حیات ز نور سید تابوے از فیض پیش در مشام رفت
 وہ عرب جن کی حالت یہ تھی، کہ

وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (نساء-۲۱) اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں،

دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایان کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں
 بھی اُن کو ذکر الہی سے غافل نہ کر سکیں،

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت
 ذِكْرِ اللَّهِ (نور-۵) کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا،

اُسے بیٹھے چلتے پھرتے غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بے قراری تھی،

يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جو خدا کو اٹھتے، بیٹھے اور لیٹتے یاد کرتے
 جُلُوسٍ (ال عمران-۲۰) زین،

راتوں کو جب غافل دنیا، نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بسترِ دل سے اٹھ کر خدا کے سامنے سر بسجود اور
 راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے،

تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ جن کے پہلو (رات کو) خوابگاہوں سے علحدہ

رَبِّهِمْ حَرْبًا وَطَمَعًا،

رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار

(سجده ۲-۴)

کو پکارتے ہیں،

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ،

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو

(موسلات ۲)

تو نہیں جھکتے،

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

تَرَاهُم مَّرْكُومًا مُّتَجِدِّدًا يُبْتَغُونَ فَضْلًا

تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ

مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا (فتح ۴)

میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی، کہ

وَإِذَا دُكِّرَ اللَّهُ وَجِدْكُمْ أَشْتَاتٍ لِّفُلُوبٍ

اور جب تمہارا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل

الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ (زمرہ)

جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہمکدہ ہو جاتے ہیں

آفتاب نبوت کے پر تو نے ان کو رآئینوں میں خشیت الہی کا جو ہر سیدہ کر دیا،

الَّذِينَ إِذَا دُكِّرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ

وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے

(انفال ۱- وجہ ۵)

دل دھل جاتے ہیں،

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے عمل اور تعلیم نے عرب

کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے

تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں، یا تجارت، یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد

سے غافل نہیں کرتی تھی، تمام وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن

جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یادِ الہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو

پوری طرح ادا کرتے تھے، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی، دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔

صحابہؓ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے، خدا نے گواہی دی،

إِنَّ سَرَدَكُمْ يَكْفُرُ أَنتُمْ تَقْوِمُوا أَذْنِي مِنْ
ثُلَاثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلَاثَهُ وَطَائِفَهُ
مِنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط

کے بعد اٹھتا ہے، اور تیرے ساتھ ایک جماعت

(منزل - ۲) بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے،

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جلوس دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے،

وَنُفِثَ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي
بِرَأْسِكَ جَبْنَ تَقْوَاهُ وَتَقَلُّبَكَ فِي
السُّجُودِ، (شعراء - ۱۱)

اور اس غالب رحم واسے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے، اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا

مدینہ منورہ میں اگر مسیح پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعَمُوا الطَّعَامَ وَافْتَرُوا
اسے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ، اور سلام کو پھیلاؤ

سہ صحیح بخاری باب التجارة فی البرمرسل، سنہ فتح الباری جلد ۱ ص ۲۵۳ بحوالہ عبدالرزاق،

السَّلَامُ وَصَلُّوا وَالنَّاسُ بِهَا وَرَدَمَدِي) اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں،

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انھوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عثمان! تمہارے جسم کا بھی تپیر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سونو بھی۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے میں اُن کی بیوی، اور تیسرے میں ان کا غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ و ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی، حضرت ابو درودؓ و اُن صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے، حضرت سلمانؓ فارسی اُن کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ اُن کے ہاں جا کر ہمان ہوئے جب رات کو حضرت ابو درودؓ و اُن عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا، پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، کہ اب نماز کا وقت ہے، کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عداً قضا کی ہو، یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرخطر کام کے لئے کہیں بھیجا تھا جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا، تو وقت نکل جائے گا، اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انھوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے

۱۔ ابو درود باب القصد فی الصلوۃ ۲۔ ابو داؤد کتاب الصلوۃ فی وقت قیام ابنی سلم من الین ۳۔ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الخش ۴۔ صحیح بخاری کتاب الصوم ۵۔ صحیح بخاری کتاب الصوم

جاتے تھے سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے، پھر وہ جس خضوع و خشوع، محویت اور استغراق کیسا نماز ادا کرتے تھے، اس کا نظارہ بڑا پُر اثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی، کہ کافر غور توں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا، حضرت عمرؓ نے میں اس زور سے روتے تھے، کہ ان کے رونے کی آواز پھلی صاف تک جاتی تھی، حضرت تیمم داریؒ ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے، صبح شنبہ صبح وہاں مجتہدین، حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سو مرتبہ پڑھ ڈالتے تھے، اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے، اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے، کہ حرم محرم کے کبوتر ایک سطح جا نہ سمجھ کر ان کی پیٹھ پر راکر بیٹھ جاتے تھے،

ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں، اور دوسرے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تاک کر تیرا تارے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون سے تر ہوتے ہیں، مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں، ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے، میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کے بغیر نماز توڑ دوں۔

۱۔ ابو داؤد باب صلوٰۃ الطالب، ۲۔ نسائی، کتاب الامارہ باب المحافظة علی الصلوٰۃ، ۳۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب اذابک الا امام فی الصلوٰۃ، ۴۔ صحیح بخاری کتاب الحجۃ، و کتاب الصلوٰۃ، باب المسجد کیون فی الطريق، ۵۔ اسد الغابہ تذکرہ حضرت تیمم داری، ۶۔ صحیح بخاری باب الکلمات میں اسجدتین، ۷۔ حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصحابہ و اصحابہ وغیرہ، ۸۔ ابو داؤد کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم،

اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیرون کا منہ برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سرد گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر رہے ہیں، کہ دفتہ نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں، اور ایک اللہ اکبر کی آواز کیستے موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں،

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظم امام نماز ہے، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں، دفتہ ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے، اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر تسکیم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے، آپ غش لکھا کر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، پہلے صبح کا دو گانہ ادا ہو لیتا ہے، تب خلیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے،

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لئے جگایا، تو بولے ”ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں، چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی۔“

حضرت علیؓ مرتضیٰ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں، کہ ابن کلم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں، امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کو بلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں، عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوئی ہیں، ہزاروں اشقیاء آپ کو زخمین لئے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں، کہ ”وہ اتنا موقع دین کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔“

نماز میں جس خضوع و خشوع کا حکم ہے صحابہ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی، تو انھوں نے اس کو اس ذوق پر نشانہ کر دیا، حضرت ابو طلحہ انصاری اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آکر چھپانا شروع کیا، حضرت ابو طلحہ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے،

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے، باغ اُس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلون سے لدا ہوا تھا، پھلون کی طرف نظر اٹھ گئی، تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا راہ خدا میں دیتا ہوں چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار مین فروخت ہوا،



زکوٰۃ

وَأَتُوا الزَّكَاةَ

زکوٰۃ کی حقیقت و مفہوم | نماز کے بعد جس کا اہل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے، اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے، جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی، اور باہم ایک دوسرے کی امداد، اور معاونت کا نام ہے، اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ ہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق تقسیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے، لیکن فقہی اصطلاح میں "زکوٰۃ" صرف اُس مالی امداد کو کہتے ہیں، جو ہر اُس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو،

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں | زکوٰۃ بھی اُن عبادت میں سے ہے، جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے، لیکن اُن کے پیروں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا، کہ بظاہر اُن کے مذہبی احکام کی فرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا، حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے، کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا، اُس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں،

أَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، (تبعہ۔ ۱۰) ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار کیا تھا کہ کھڑی رکھو

نماز اور دیتے دیو زکوٰۃ،

لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ، (مائدہ ۳) (اسے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے

حضرت اسمٰئلؑ کے ذکر میں ہے،

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكَلْبِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ
صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا
كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ
وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (مريمہ-۴)

اور قرآن میں اسمٰئلؑ کا ذکر کر کے شک و شبہ
کا سچا تھا، اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا، اور وہ اپنے
لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا، اور وہ اپنے
رب کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں،

وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ
حَيًّا، (مویہ-۲)

اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ
دینے کی تاکید کی،

توراة سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں
(اجارہ ۲۶-۳۰-۲۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عموماً پر خواہ انیر ہو یا غریب آدھا شتال دینا
واجب تھا، (خروج ۳۰-۱۳-۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج کھلیان کی منڈیہ بالین اور پھل و آٹے
درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ علاہ ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی یہ
رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کیجاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ
حضرت ہارونؑ کی اولاد (لاویہ) قومی خاندانی کا ہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال میں
دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی دہانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیوا
اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا، اور نقد آدھے شتال والی زکوٰۃ کی رسم جماعت کے خیمہ ریا
مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی،
حضرت عیسیٰؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی،

بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل تو (۱۸-۱۰) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) دیا، نماز میں، اور
فرز کے لئے دیتا ہے اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔" اسی انجیل کے ۱۱ دین باب کی پہلی آیت

اگر کوئی دولت مند ہو، اس کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ میں

کوئی غریب بیوہ یتیم، دل سے دودھ مری ڈالے، تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولت مند

کی زکوٰۃ سے کمین بڑھ کر ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹائے،

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے، مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں

داخل ہونا مشکل ہے، (متی ۱۹-۲۳)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے تیر اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود اُدھے مثال

والی زکوٰۃ ادا کی ہے، (متی ۲۳-۲۴)

تورات کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گائوں تک محدود

تھی، اس لئے انہیں دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور ان کے سکون کی چونکہ قلت

تھی، اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں

کی علاوہ برین زکوٰۃ کی سنت کی نہیں کہ وہ ہر سال یا دو سال سے یا تیس سال واجب الادا ہے، تصریحاً

معلوم نہیں ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے، یعنی وہ کہاں خرچ کیا جائے، اس کی تفصیل بھی خود تورات

کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے،

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، اگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا، اور خصوصاً عرب میں جہاں

کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیال ہی نہ تھا، قرآن نے

ان کو یاد دلایا کہ

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ نماز پکڑی رکھنا
اَلَا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَانْتُمْ مُّعْرِضُونَ اور زکوٰۃ دیتے رہنا پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے
(بقیہ ۱۰-)

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزون نہیں ہو سکتا تھا اور
نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود
تھے تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا
تھی، جن کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا،

اسلام کی اس راہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا کیلی کارنامہ انجام دیا، اس نے
نہایت خوبی اور وقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کارڈ

کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور
ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا چاندی اور
جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں، سونے چاندی میں چالیسواں حصہ
اور پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا، جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و
قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں، پھر اس زکوٰۃ سے ہر قوم کے مصارف کی تعیین و تحدید
کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا،

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے اُن میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی کیلی حیثیت

کو نمایان کرنا ہے،

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت | اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ وحی میں نماز کے ساتھ
ساتھ جو فریضہ سب اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الہی میں سے ہے، اور زکوٰۃ حقوق عباد میں

ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے، قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک میں میں مقامات پر "اقام الصلوٰۃ" کے بعد ہی (ایتاء الزکوٰۃ، آیا ہے، مثلاً اَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ) یا اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدد یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے، بارگاہ نبوی میں اگر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہیں، چنانچہ حضرت جریر بن عبد اللہؓ بھی کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تین باتوں پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا" وفد عبد القیس نے سہمہ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی، سہمہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اسلام کا داعی بنا کر مین بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ "پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دو ہاتھوں سے لیکر ان کے غریبوں کو دی جائیگی، صحابہ میں جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف تلوار کھینچی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا،

لے یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۵۱ میں، سہ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۹۹ کتاب الزکوٰۃ جلد اول،

کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا
خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کر لیا میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم جو رسول اللہؐ
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑیگا، حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جسکو
صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا، اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت
کی گردن جھکا دی،

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دنیا و دن
پر قائم ہے، جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظام روحانی نماز باجماعت سے
جو کسی مسجد میں ادا ہوتا ہے، اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب
ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں، اور ان کی انفرادی حیثیت کیساتھ
ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدیؐ نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر
بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال
کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے، مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں
یہی سبب ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں
داخل نہ کریں گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے، تو شریعت محمدیؐ کے شناساے راز نے ان کی اس
تجویز کو قبول نہیں کیا، اور بزور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم
کر لی جاتی، تو اسلام کی وحدت کا سرشتہ اسی وقت پارہ پارہ، اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام

۱۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲ درحقیقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے طرز عمل کا اخذ قرآن پاک کی یہ آیت
تھی، فَأَتَتْهُمُ الْمُسْتَرِكُونَ حَيْثُ وَجَدَتْهُمْ... فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ
(توبہ - ۱۰) ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ۔ تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ
دین تو ان کو آزادی دے دو، نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۹۱ باب سبکراہیتہ الاختلاف،

اسی وقت درجہ برہم ہو جاتا،

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریقہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے، زکوٰۃ کا آغاز اور اس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدتیہ اگر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، تدریجی تکمیل

اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدا سے اسلام ہی سے شروع ہوئی

لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا، بعض سورخون اور محدثون کو اس بنا پر کہ شہر میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مرادف تھا، اس کی مقدار انصافاً سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا منظر عظیم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی، تو اس پکار کی ہر آواز، انہیں دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی، انھیں صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجہ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپ کی نسبت فرمایا، "آپ قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کھاتے ہیں، نمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کو مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں، غور کرو کیا زکوٰۃ انہیں فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ تو اُمّ ہیں اور انہیں دو اجمالی

لے صحیح بخاری جلد اول باب اول،

حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے،

سورہ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے،

وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ، (مدثر-۱) اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر،

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَا تَكُن مِّن تَسْتَكْبِرِينَ، (مدثر-۱۱) اور بدلاہست چاہنے کے لئے کسی پر اہسان نہ کر،

یہی وہ بیج ہیں جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، مدثر کے بعد سورہ مزمل اُتری

اس میں یہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں، اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی لگائی ہے،

وَأَقِمْ وَ الصَّلَاةَ وَالْزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا، اور نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا کر

اللَّهُ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا تَقَدَّمُوا لَكُمْ فَانْفِسْكُمْ، دو، اور جو تم آگے بھجو گے اپنے واسطے اس کو خدا

مِن خَيْرٍ خَيْرٌ وَقَدْ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ، اس کے پاس بہتر اور تو اس میں زیادہ پاؤ گے،

بہشت کے پانچویں سال جب حضرت جعفر وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں، اور نجاشی نے اپنے

دریاب میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی نعمیات دریافت کی ہیں، اور حضرت جعفر نے اس کے

جواب میں جو تقریر کی ہے، اس میں ہے، اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، اور سے رکھیں، اور

زکوٰۃ دیں، اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور قدوس

کے رجوع تقریباً ۱۰۰۰ سال پہلے آیا تھا، سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان میں ایک زکوٰۃ

بھی تھی، ۱۰۰۰ سال پہلے جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد، ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے

لے مسند احمد جلد اول ۲۱۳، ۲۱۴ صفحہ بخاری کتاب الزکوٰۃ،

اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انھوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا بھی تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ شہ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بشت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی،

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا، اس لئے حالات کے اقتضار اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلق احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی، مگر معظّمہ میں مسلمانوں کی پریشانی پر آگندگی، شکستہ حالی، اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی اُن کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی قلم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں، چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی،

وَمَا آذَرْتُكَ مَا الْعَقَبَةُ فَلَقَ رَقَبَةً
أَوْ لَطَعَا فِي يَوْمٍ ذِي مَسْجَةٍ، يَتِيمًا
ذَا مَقْرَبَةٍ، أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ،

اور تو کی بھیجا کہ وہ گھائی کیا ہے کسی دق مضد ریا
قیدی یا غلام کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن
میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو، یا خاک میں
پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھانا، (مبلد-۱)

عام قریش پر جنھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا، عتاب آیا،

فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ رَوَا
يُخْشَى عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ، (ماعدۃ-۱)
كَذَلِكَ لَا تَسْمَعُونَ الْيَتِيمَ رَوَا
تُخْشَى عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ، (فجر-۱)

وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور
غریب کے کھانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا،
یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور
اکیس محتاج کے کھانے کی تاکید نہیں کرتے،

سے صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ و کتاب التفسیر

اور مسلمانوں کے اخص 'بابی ہمدردی' اور ان کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی، کہ

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِمْ مُسْكِنًا وَ
يَتِيمًا وَآسِيرًا، إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ
لَا نُزِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا نُنْكَرُكُمْ،
اور وہ دعا جہند ہونے کے باوجود محتاج یتیم، اور
قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو
صرف خدا کے لئے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے

ہیں نہ شکریہ،

(دھر-۱)

مدینہ منورہ اگر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انھوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ
کے ساتھ ساتھ ستم میں صدقہ الفطر واجب ہوا، یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے
پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر
خوشی اور مسرت سے گزاریں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید لگ گئی، انھوں
نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! ہم کیا خیرات کریں،

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، (بقرہ-۸۴)

وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں،

ارنما و ہوا،

کہہ دیا ہے پیغمبر! کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ

قُلْ اَلْعَفْوُ، (بقرہ-۸۴)

رہے، (اسکو خیرات کر دو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے، صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے، عزا
جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا، کہ جو کچھ
بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں، آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں، کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت
اسی کی تقاضی تھی، کچھ دنوں کے بعد عرب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں تجارت کی آمدنی
شروع ہوئی تو حکم ہوا،

لے آیا غنہ طبری
طیوہ پ ۱۲۵
لے کیا زکوٰۃ
تاریخ اسلامی
جلد ۲ صفحہ ۲۱۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا انْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ
مَا كَسَبْتُمْ. وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ
اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں
جو تم تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں، اس میں سے
(بقہ ۵-۳۷) کچھ خیرات میں دو،

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ
وَمِمَّا سَرَّ قُلُوبُهُمْ يُنْفِقُونَ،
اور ہم نے اُن کو جو روزی دمی ہے اس میں
(بقہ ۵-۱) سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں،

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار
رہتے تھے، چنانچہ پیغمبرؐ کو ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے، تو غریب و نادار صحابہؓ نے اگر عرض کی کہ اے
خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے،
خود بھی فائدہ اٹھائے، اور دوسروں کو بھی صدقہ دے، انھوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی
طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انھوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر
اس کی بھی قدرت نہ ہو تو ارشاد ہوا "تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے یہی اُس کا صدقہ ہے" پھر
صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پر ان ترغیبات اور نصیحتوں کا صحابہؓ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر
بوجھ اٹھاتے تھے، اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے،

لیکن با این ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا، اور اس لئے اُس کا
کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان سہ ماہی کی فتح نے تمام عرب کو ایک سرشتہ میں منسلک
کر دیا، اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،
حُذِّ مِّنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةٌ تُطَهِّرُهُمْ

(اے محمد رسول اللہ) ان کے مال میں سے

سہ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، ۱۵۸ ایضاً،

وَتَزَكِّيَهُمْ جِهًا

مدتہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ جسکے ذریعہ سے تم ان کو

پاک و صاف کر سکو

(توبہ - ۱۳)

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹۰۰ء میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں مصلیوں اور عاملوں کا تقرر ہوا، اور باقاعدہ ایک بیسٹ لمال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام و قوانین سورہ برات میں مذکور ہیں، جو ششم کے آخر میں نازل ہوئی ہے،

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین | اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط و تفریط تھی، تورات میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا، (استثنا ۱۴-۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعیین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب لاوا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو، اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں کو ہسینو اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے، اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیوپار کرنا ہے، آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف گزر جائیں تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سکے، اور زمیندار کا شتکار، تاجر، نوکر، صنّاع، ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے، بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل

کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے، ان تمام وجوہ سے ہر منظم جماعت، ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعت محمدی نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے، اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے، چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۃ توبہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں، زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے،

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ
شَهْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ ، (توبہ - ۵)

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں
جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا،

زکوٰۃ کی مقدار | توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار، پیداوار کا دسواں حصہ تھا، اور نقد میں آدھا متاع جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا، لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے، اور کہیں نہر کے پانی سے، جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہوتا ہے، نقد و دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت، مفت ہاتھ آجاتی ہے، اور بعض اوقات محنت محنت کرنی پڑتی ہے، اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا، انجیل نے حسبِ استطاعت اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا ملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیکل کانفی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی، اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دیدی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو چاہے، اور جب چاہے خدا کی راہ میں دیدے، اس کا نام

سچہ کرے کی مدت جس پچھینے، گاسے کی نو، اونٹ کی گیارہ، اور بھینس کی بارہ مہینے ہے،

اتفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے، اور اس کا نام زکوٰۃ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا،

الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۱﴾
 الَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلَّذِينَ
 وَلَهُمْ حُجُورٌ (معراج-۱)

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عکلاً رائج ہے، چنانچہ قرآن پاک میں مَعْلُوم اور مَعْلُومَات کے الفاظ جہاں آئے ہیں، وہاں یہی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا، عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے، یعنی پیداوار میں دسواں حصہ، اور نقد میں نصف مثقال، انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت ربانی سے ایسا اس زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں، اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عامل کے پاس بھجوا دیا، یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے، اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں، اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے،

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی، اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے، زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار

چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو فرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہوا ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مد نظر تھی، اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ (رہم) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل و عیال کے نان و نفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مدد میں صرف کر سکیں،

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے، "غنم" ہے، قرآن نے کہا،
 وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ
 خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ
 وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ
 اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں
 حصہ خدا کے لئے، اور رسول کے لئے اور قربان
 کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں
 کے لئے ہے، (الأنفال - ۵)

نکتہ: اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصل مقصد دین کی حمایت اور اعلانِ کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصولِ غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی، اور نہ اس کا کوئی ثواب ملےگا، اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بنا پر حقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظامِ جماعت کا حق ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہو، یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا

اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر "رکاز یعنی
دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غریب ہاتھ آجائے جس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا
حق تسلیم کیا گیا ہے،

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، تو رات نے
ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا، شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ بینی کے ساتھ پیداوار کی
مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے ان اقسام پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو
کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں، تاکہ ان سے حسب انتشار خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے، اور نقصان کا
اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں، کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں
فرمائی گئی، اسی طرح اس مایست پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس
سامان، اسباب، سواری، قیمتی پتھران پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما
پانے والی چیزیں چارہ، زمین، جانور، سونا چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں
چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی،

زمین کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کے جوتے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچہ گواشتکار
کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت
اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی فنی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب
ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے ادھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱۰٪) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری
قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی فحی محنت اور مزدوری سے ہو، مثلاً کوئین سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر
پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ (۲۰٪) مقرر ہوا، نقدی سرمایہ جس کی ترقی،
حفاظت، نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزائش

کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا، یعنی چالیسواں (۱/۴) حصہ مقرر ہوا، (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے) زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اسکا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے، وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں، جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لیکر گاؤں گاؤں، شہر، شہر اور ملک بھاک پھرتے ہیں، اور اسکی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے، اور فقہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا میاں رغلہ سے گراں تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہیں، اس لئے نسبتاً وہ قوی ضروریات، دین کی مالی خدمات، اور مستحقین کی امداد میں اس "انفاق" یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں، جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک، اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے،

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تین زمین اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چوبیس

لے یکم کا نظر ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے،

امامت و حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہیں اس لئے وہ کل کا خمس یعنی $\frac{1}{5}$ مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورہ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں، صرف آٹھ ہیں اس بنا پر آٹھ مصارف کی شرح مقدار $\frac{1}{8}$ کا $\frac{1}{5}$ حصہ (یعنی $\frac{1}{40}$) مقرر ہوا یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں ان آٹھ مصروفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مائل سونا ہوان و دوسو درم کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائیگا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ و $\frac{1}{40}$ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ تقسیم و تحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے جانوروں پر زکوٰۃ [توراة میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ کا تھا، لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپان نہیں ہو سکتا، اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت، کیفیت اور کیفیت) کی بنا پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، مثلاً خچر، گھوڑے، دیا ہندوستان میں ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہیں، دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت، افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح خالصہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا، اور ربانی نہیں، بلکہ فرامین کی صورت میں، لکھو اگر عقال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفائے راشدین نے اسی کی تقلید حد و حکومت میں بجاوین، اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے،

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں،

۱۔ اجار ۲۴-۲۵ حصہ خفیہ کے نزدیک خیل متنازلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہر سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں

نام جانور	تعداد	شرح ذکوۃ
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری،
"	۱۰ " ۱۲ "	دو بکری،
"	۱۵ " ۱۹ "	تین بکریاں،
"	۲۰ " ۲۴ "	چار بکریاں،
"	۲۵ " ۳۵ "	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
"	۳۶ " ۴۵ "	اونٹ کا دو سالہ بچہ،
"	۴۶ " ۶۰ "	تین سال کا اونٹ کا بچہ
"	۶۱ " ۷۵ "	چار سال کا اونٹ،
"	۷۶ " ۹۰ "	دو سال کے دو بچے،
"	۹۱ " ۱۲۰ "	تین سال کے دو بچے،
"	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ،
"	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ،
بکری	ایک سے ۹ تک	کچھ نہیں،
"	۱۰ " ۱۲۰ "	ایک بکری،
"	۱۲۱ " ۲۰۰ "	دو بکریاں،
"	۲۰۱ " ۳۰۰ "	تین بکریاں،
"	پھر ہر تلوپر	ایک بکری،
گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۹ تک	کچھ نہیں،

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
گائے، بیل، بھینس	۳۰	ایک، دو سالہ بچھڑا،
"	۴۰	تین سال کا ایک،
"	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے،
"	۷۰	ایک تین سال اور ایک ٹٹ سال،
"	۸۰	تین سال کے دو،
"	۹۰	تین
"	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک،
"	پھر ہر دس مین	ایک دو سالہ،
<p>نصاب مال کی تعیین شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے، اُن میں امیر و غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بیس روپیے والوں، یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کیجاتی، تو ان پر ظلم ہوتا، تو راء میں غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہ دیا گیا ہے کہ</p> <p>" خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے " (خروج ۳۰-۱۵)</p> <p>لیکن شریعت محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، اور غریبوں، ناداروں، امقرضوں، اور اُن غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت</p>		

کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال سونے کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درم چاندی کے سیکے ہین، یعنی ایک اوقیہ چالیس درم کے برابر ہے، وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
قلعہ اور پھل	پانچ وستق سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
اونٹ	پانچ عدد " " "
گائے بیل بھینس،	۳۰ عدد " " "
بھیر بکری،	۴۰ عدد " " "
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہیں،

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہو گئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی مہول سے بری ہو گئے،

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گونا گونہ ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہین، پانچ وستق قلعہ، دو سو درم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہین

۱۔ موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا سات تولہ کے، اور دو سو درم چاندی ۵۲ روپے کے برابر ہے،
۲۔ سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یطی الزکوٰۃ وحد الغنی جلد اول ص ۱۹۱، اصح المطابع لکھنؤ،
۳۔ ایک وستق وہ بوجہ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو،

اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس درہم یا سہ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی،

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات

حضرت موسیٰ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھ مثقال سونے چاندی کی، یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے ملائی و تقرری

غرف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی (خرچ ۳۰-۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کسیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونون اور گوشون میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں، وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا، (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یعنی کہ ہر سیرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے، اور لادینوں میں جو سو روٹی کا ہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہین، نام بنام تقسیم کیا جائے، اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے، اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے نزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں یتیموں اور یتیموں کو کھانا کھلایا جائے، (استثنا ۱۴-۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱۔ وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر منت خود کا ہون اور عبادت کا ہون کے فادمون کی ضرورت ساقط ہو گئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعیاً بیکار تھا، کایہ اڑ گیا،

۲۔ عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسوم اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں اور محرکوں کے ملائی شمعوں کی ضرورت ہی نہیں رہی

۱۔ ہدایہ جلد اول، باب الزکوٰۃ فی التجارۃ،

۳۔ حج اُن ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی، اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہو گئی،

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی مانعت کر دی گئی، کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہو گئی تو اس میں ایثار کیا ہوا،

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور زمین جو ان مدون سے یمن، غریبون، مسکینوں، اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں،

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں، مثلاً ۶۔ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کھانا پاک کر غبار میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں، اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرفت کریں،

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعت محمدیہ نے بین مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام مستحقین کے ہاتھوں میں دیدیا،

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا، اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزون ہو سکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر بیڑوں کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے،

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لاپچ کرتے تھے

جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو وطن و طرز کرنے لگتے اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادت بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کر دی، اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیا جاسکتی ہے چنانچہ سورہ توبہ کے ساتویں رکوع میں اسکا مفصل ذکر ہے،

۱۰۔ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی، اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلنا بیٹھنا، اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی انکے عیش و عشرت کے پر تکلف سامانوں کے نذر ہو جاتا، اس لئے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لیگا، اس کیلئے یہ حرام ہے، اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دیگا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا با مکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے،

۱۱۔ اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (نبولادی) کو ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ خاندانی کا بن مقرر ہوئے تھے، مگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر تہ قطعی طور پر حرام قرار دی،

۱۲۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے،

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں، اور زکوٰۃ کے

وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَاتِ قُلُوبُهُمْ فِي صیغہ میں کام کرنے والوں، اور ان لوگوں کیلئے

الرِّقَابِ الْغَارِعِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملنا ہے،

وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِجَةً مِّنَ اللّٰهِ اور گزرنے والوں کے لئے جو تازان بھریں ان میں

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

اور خدا کی راہ میں، اور مسافر کے بارہ میں، یہ خدا کی
دن سے ٹھہرایا ہوا ہے، اور خدا جانتے والا اور حکمت
والا ہے، اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے

(توبہ - ۸)

نقدار میں ان خود دار اور مستور الحال شرفا کو ترجیح دی ہے جو دین، اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف
ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور جاہل ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں
پھیلاتے، اور اپنی آبرو اور خود داری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

لَا يُلْقُوا أَعْيُنَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ أَغْنَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ
بِسِيئَاتِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِعْجَافًا

ان مفلسوں کو دنیا ہے جو اللہ کی راہ میں انکے لئے
ہیں اور زمین میں (روزی چاہل کرنے کے لئے)
چل پھر نہیں سکتے، نادان ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے
ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرے سے
پہچانتے ہو، کہ وہ جاہل ہیں، وہ لوگوں سے پکڑ نہیں

(نقرہ - ۳۷)

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت، اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دنیا چاہئے، چنانچہ ہی سورہ میں فرمایا
وَأَقِ الْأَمْوَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْتَغِ الْسَّبِيلَ
وَالسَّابِلِينَ فِي الرِّقَابِ

اور جس نے خدا کی محبت پر، (یا مال کی محبت کے
باوجود) قربت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں
مانگنے والوں، اور غلاموں یا مقروضوں کی (گرد
چھڑانے میں مال دیا،

(نقرہ - ۲۲)

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے،

قُلْ مَا أَلْفَقْتُكُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلَا آلَ بَنِي إِسْرَءِيلَ
أَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالنَّكَارِ

کہ جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے مان باپ بنی اسرائیل
یتیموں، مسکینوں، اور مسافروں کے لئے،

دو ضرورت مندوں | اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے، انہی کو ترجیح
 اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے
 لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا، اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے
 ہی رشتہ دار ہیں، اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی غلط
 اور فریب تھا، ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں وہ تاثر تعلقات کی کمی و بیشی پر مبنی ہیں،
 جو بقدر قریب ہے، اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اُس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری
 اور قرابت بندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور بطل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر
 اہل و عیال کا اُن کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ رہے، تو اس میں حصہ پانے
 کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اسی اصول کی رعایت لگائی ہے،
 یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے، تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا، ایک
 قسم کا مغالطہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں
 کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائیگی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے
 جس کو دور ہو جانا چاہئے، متعین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزوں پر ہے
 ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور
 ضرورتوں کی کمی و بیشی، قرابت مندوں کی ترجیح کے یہی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو
 ان کو اُن لوگوں پر ترجیح ہے جن کی ضرورت، اور حاجت بندی ان سے کمین زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے
 کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپکا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ
 آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی و بیشی ترجیح
 کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے، کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں

اور دوستوں کو ترجیح دے،

سلا فقراء اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ در بدر بھیگ مانتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عورت و آبرو اور خود کو کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا: "مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دولتے در بدر پھرایا کرتے ہیں" صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے ارشاد ہوا: "وہ جس کو حاجت ہے، لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا، اور وہ کسی سے مانگتا نہیں"۔

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیکھا، اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اس لیے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی تو یہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہئے، جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کرتے ہیں، کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے، کہ بے حیاء اگر دن کی عورت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے،

شریعت نے مصارفِ زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی بہت نہ ہو، اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل باجی نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحی الہی نے ان کی پرودہ درمی ان الفاظ میں

وَمِنْهُمْ مَنْ يَكْمُرُكَ فِي الصَّدَقَاتِ
فَإِنْ أَعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا

اور بعضے ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (پسند کر)

زکوٰۃ بانٹنے میں ملنے دیتے ہیں، اگر ان کو اس سے

لے صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا فطن له فیصدق علیہ،

مِنْهَا إِذَا هُمْ يَخْطُونَ، وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا
 مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا
 اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ
 إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ إِنَّمَا الصَّدَقَتُ
 لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا
 وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ لَفَاءٍ
 وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً
 مِنَ اللَّهِ ط

مے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش
 ہو جائیں اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی
 رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا
 اور کہتے کہ ہم کو اللہ ہی ہے ان کو اللہ اپنی مراد
 سے اور اس کا رسول دے رہیں گے ہم کو تو
 خدا ہی چاہئے زکوٰۃ توقع ہے غریبوں کا سکینہ
 کا، اور اس کا کام کرنے والوں کا، اور ان کا چنگ
 دل (اسلام کی طرف) پر چاہئے، اور گردن
 چھڑانے میں، اور خدا کی راہ میں، اور مسافروں میں حقے

(توبہ ۷۰ء) خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست
 کی، آپ نے فرمایا: اسے شخص! اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار
 نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اُس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں،
 اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں فقر
 اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی
 ہشتنگا نہ،

روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لنگڑے، مفجوع، کوڑھی، یا وہ
 محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ

سہ ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الصدقة و حد الغنی

اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی متعلم، بالغ طالب علم، جو الفقراء الذین
 اُحْصَوْا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ مِینِ اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں اصحابِ مٹھے داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت
 اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فائدہ کرتے ہیں،
 وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا، یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے
 اپنے کام کی اجرت پاسکتے ہیں، اور رَاٰلُؤْفَقَهُ قُلُوْبُهُمْ (جن کی تالیفِ قلوب کیجائے) میں وہ لوگ
 داخل ہیں، جنکو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے، وَفِي الرِّقَابِ (رگوں
 کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر
 آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہیں، جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، وَالْخَائِمِينَ (تاوان اٹھانے
 والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصاحبت کرانے کیلئے
 کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ
 کے بیت المال سے ادا کیجاسکتی ہے، وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم
 کے نیک کاموں کو شامل ہے، اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی، یا سفر حج، یا اور دوسرے
 نیک کام مراد لئے جاسکتے ہیں، اور دَابِّنِ السَّبِيلِ (مسافروں) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ
 مسافروں کی راحت و رہائی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر
 بھی داخل ہو سکتی ہے، یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم

لے اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد دیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَاءِ الذِّیْنَ اُحْصَوْا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق مراد جہاد نہیں، بلکہ ہر نیک اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی
 ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو الفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ شبہ ہو ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو، جیسے خَلَقَ نَكَحًا
 مَا فِي الْأَرْضِ حَيْثُ مَا كَانَ، کتاب الخراج، تاجی ابو یوسف، باب الصدقات،

رقم کو خرچ کرنے کی تاکید ہے،

مسکینوں، یتیموں اور زکوٰۃ کا سب سے اہم مہرت یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، بولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، معذوروں کی امداد

معاذ اور دوسرے معذوروں کو ان کی امداد کی جائے، نادار یتیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مضرت ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے، اور ان مستحقین کی یہ قابلِ فہم حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف تصور کئے ہیں جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے،

غلامی کا انسداد | غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بڑھ چلی زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرق و نقد ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس میں کواد کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے اس درمائدہ بلبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی قطبہ دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آسکتی، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کوئی ہوئی آزادی واپس لے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی، کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے، جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے،

مسافر گذشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور وقتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسافر کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی اصحاب اور بیابان جنگل اور

میدان آبادی اور دیرانی، ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال، عزیز و قریب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہک کر کہاں سے کہاں بچتے ہیں ان کے پاس کھانے کیلئے کھانا، پینے کیلئے پانی ہونے کیلئے بستر اور بٹھنے کیلئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر زمان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے، اسی اہول پر سرائین، کنوین، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں،

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ کہن اور داستان پارینہ ہو گئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بینک، اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں، اور مسافر و حضرین کوئی فرق نہیں رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دو متمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت و آسائش کے لئے ہوتا ہے اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہان امیر اور دو مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریستوران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے مہینے تک کسی حضرت مسیحؑ کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں، کسی کی جیب میں جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چیک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں، کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ نبیؐ لورع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول و عرض میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے قبضہ میں آئے، مسراؤں، مسافروں، کنوؤں اور حمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان آپس کے کنارہ سے چل کر گھر کے ایک گاؤں میں بہ آرام و آسائش پہنچ جاتا تھا، اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے

تک اہل باہل و اوطان با و طان کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا اور آج بھی اس نظام کی بدولت اُن اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہیں ہیں، غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے، اور امراء اور دولتمندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہان گرد ستیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق،

نعم بکوبہ و دشت و بیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات | جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات کی صورت

پیش آتی ہیں، جماعت کے کمزوروں، معذوروں، اور مفلسوں کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں، اور مقرضوں کی ہڈیاں کرنا، جماعت کے ان کارکنین کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجالائیں، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و نسق کے قرائض انجام دین، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے،

زکوٰۃ کے مقاصد فوائد | زکوٰۃ کا اصل اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ "زکوٰۃ" کے اندر ہے، "زکوٰۃ" کے لفظی اور اصطلاحات

معنی "پاک" اور "صفائی" کے ہیں، یعنی گناہ اور دوسری روحانی، قلبی اور اخلاقی برائیوں

سے پاک و صاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے، سورہ وائس میں ہے،

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ شَرَّكَهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ

مراد پایادہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا

دَشَّهَا، (شمس - ۱)

نادر ہوا، وہ جس نے اسکو نکلا اور گندہ کیا،

ایک اور سورہ میں ہے،

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى، (اعلیٰ - ۱)

مراد پایادہ جو پاک و صاف ہوا،

یہ تزکیہ اور پاکی و صفائی نبوت کے اُن تین عظیم نشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جنکا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے،

يَتَذَكَّرُ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِي وَبِزَكٰتِهِمْ وَيُطَهَّرُوْنَ (توبہ ۱۰۳)

اُن کو گناہوں سے پاک و صاف کرتا ہے اور

اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے،

تزکیہ نفس | ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی و صفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے غفلت و رجاہ اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نمازی سے ہوتی ہے، لیکن دوسرا بڑا سبب، ماسوائے اللہ کی محبت، اور مال و دولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے، زکوٰۃ ہی دوسری بیماری کا علاج ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے بارغ وستان کی محبت کے سبب جو ان کی دولت تھی، منور ہوئی، عدم شرکت کا جرم صادر ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت اور پاکائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا۔ وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ

وَيُزَكِّيَهُمْ بِهَا، (توبہ ۱۳۳)

وصاف بنا،

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے عیوب و مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جبر کا نام محبت مال ہے۔ دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا آئینہ علاج ہو جاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر تیار کرنا انسان سیکھتا ہے، اور یہی وہ دیواریں

ہیں خیر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم، اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے،

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے،

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُغْبِطُ الصَّادِقَاتِ (بقرہ ۲۷۷) خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے، بلکہ آخری ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود کو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے، لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ و عطائے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا متحمل نظام باقی رہتا ہے، اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی، لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لیے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حرصیں اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے نوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اہل و منافع پر ایک ذبح قبضہ کر لیتا ہے، لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی مٹیاں اور کوٹیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام

معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کمرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درختان کیا یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جمین
 ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بے تہین، مختلف زبانیں بولتے
 ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری
 اختلافات، اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے
 ہیں، اور ایک ہی مقام کو اُمّ القریٰ مان کر، وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ روپ اور
 دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت
 (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام
 قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی لغتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک
 آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی
 ہیں، اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع
 میں، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا
 سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانوں
 میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا
 گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم نادر ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا
 کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بد امنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے،
 لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے
 وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں
 ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا، اور دنیا کے سامنے اس کی تبصیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے
 ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم

کے مقرب درباری، اور اسلام کے معرکوں کے فکس جاننا تھے، آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مراد تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری، فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیح نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا،

ان المکثرین هم المقلون، جو دئمند ہیں وہی غریب ہیں،

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہونگے،

پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب (جنکو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والاں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہونگے،

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں، جنکا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس علی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہو، جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں "انفاق" ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اسکا مذہبی فرض ہے، اور اس مجموعی رتسم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور عمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا، چنانچہ اپنے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر مین بھیجا، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہو،

لے ہی ۲۱۵ صحیح بخاری کتاب لرقاق باب المکثرین هم المقلون لے جانے ترمذی کتاب الزہد باب ما جاء ان فقر المهاجرین یملکون الجنة قبل ان یغنیئہم

پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

تَوَخَّذْ مِنْ غَنِيَاءَ هُمْ وَتَرَدَّ عَلَىٰ
فَقْرِهِمْ ۖ
وہ ان کے دو ہمتیوں سے لیکر ان کے غریبوں
کو لوٹا دیا جائے،

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ
جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور
بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں، اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دجوئی
کی کہ فرمایا "اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے" اس سے زیادہ
یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو،
خدا نے تعلیم دی،

۷۰۷. قَامَا لِيَسْتَيْمُّ فَلَا تَقْهَرْ، وَأَمَّا السَّائِلُ
فَلَا تَنْهَرْ، (ضحیٰ - ۱)
تو تیمم کو دبا یا نہ کر اور نہ مانگیں واسے کو
بھڑک،

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مست دھرو، کہ وہ شرمندہ ہو بلکہ
خدا کا شکر ادا کر دے کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اسکی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ
جباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائیگا، فرمایا،

لَا تَبْطُلُوا صِدْقَكُمْ بِأَمْوَالِكُمْ وَلَا ذِمَّتِكُمْ
تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر
بر باد نہ کرو، (نہجہ - ۳۶)

اس لطف اس مدارات، اور اس دجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم
سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے

سے صحیح بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الروض علی الجہیم،

کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف بہم طریقہ سے ہوتا، یا سب کو سب کچھ دے دینے کا عام حکم دے دیا جاتا، تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام، اور اس پابندی کیسا تھعل نہ ہو سکتا، اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے، اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہین تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہین، جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہین، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سمٹا ہٹری کی حالت میں ہے، اور اسکی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے،

دولتمندی کی بیماریوں کا علاج | دولتمندی اور تول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک محرکہ آلا راجش کی حیثیت سے چلا آ رہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذاہب میں جنہیں نہ تو دولتمندی کی

کوئی تحقیق کی گئی اور یہ مفلسی و غربت کو سراہا گیا ہے، بلکہ گویا اس بحث کو ناقص چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت، دو ایسے مذاہب میں جنہیں دولت کی پوری تحقیق کی گئی ہے، عیسائیت کی نظر میں دولتمندی اور تول، نجات کی راہ کا ٹٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکو کار دولتمند نے حضرت عیسیٰ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا،

”اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرے پیچ ڈال اور محتاجوں کو دے

کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا، تب آ کے میرے پیچھے ہوئے“

وہ دولتمند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا،

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے“

بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سونے کے ٹاکہ سے گزر جانا اس سے آسان ہے،

کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔“ (متی ۱۹-۲۱-۲۴)

بودہ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قوم کی دولت سے پاک ہونے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لیکر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا۔ یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا، ان کی خیر خواہی نہ ہونی دشمنی ہونی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دیکر خود اسی حال میں بنجانا کمان کی دشمنی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے جس طرح دولت مند دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے، اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کا بچانا ایک نبوتِ عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت، اور غربت بہ حیثیت غربت نیک بدار خیر و شر دونوں صفوں سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکو کار دولت مند ایک نیکو کار غریب بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہو، لغت نہیں، ہنر ہے، عیب نہیں، خیر ہے، شر نہیں، چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے، اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں، آپ نے فرمایا کہ "تم اہل عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھر پٹے آپ کے حلقہ بگوشوں میں دولت مند بھی تھے، اور غریب بھی، اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبوں نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے

لہ بخاری کتاب ابوہمایا باب ان ترک ورثۃ الخیر من ان یتکلفوا الناس،

ہیں جو ہم نہیں کر پاتے، آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دو تین صدیوں نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے، غریبوں نے پھر جا کر عرض کی تو آپ نے فرمایا: "یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آ رہا تھا، اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا، ایک دفعہ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے۔" صحابہ نے پوچھا "یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟" فرمایا "دنیا کا باغ و بہار" (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہو سکتی ہو؟ آپ نے سوال سن کر فرامال کیا، پھر پیشانی سے پینے کے قطرے پوچھے، پھر فرمایا "بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں اگر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے، تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے، اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینک دیتا ہے، اور پھر چرے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کیلئے بہترین و دگر چہ، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھانا چلا جاتا ہے، اور سیر نہیں ہوتا۔"

اس تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرمادیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے، بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کیجائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کیجائے، تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اور اگر اس کے حصول و مصرف کا طریقہ صحیح نہیں، تو وہ بری اور شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب، لے صحیح بخاری و صحیح مسلم باب انتخاب الذکر بعد الصلوۃ لے صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، و کتاب الزہد و الرقاق باب ما یحذر من ہرۃ اللہ

دونوں کے لئے یکساں ہیں، ایک سخی و فیاض و متواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور مابروشا کر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک متکبر غلیب امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرفت امراء اور دولتمندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے، اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں، دھوکا فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی، اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ "سود" کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و میراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہیں جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنادیا، مالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں، بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی، تالاب، گھاس، پراگا، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جائتی تصرف میں دیا، اور بن لڑائی کے دشمنوں سے جامل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولتمندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیسکون کا حق قرار دیا، اور اسکی وجہ بھی ظاہر کر دی،

مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ بقیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو

فَلِللَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ ہاتھ لگا دے، وہ خدا اور اس کے رسول اور یتیموں اور

وَالسَّائِلِينَ وَالْبَنِينَ وَالْمِسْكِينَ اور یتیموں اور غریبوں اور سافروں کا حق ہے تاکہ وہ لوٹ

بِئْنَ الْأَيْمَانِ يَأْتِيَهُمْ مِّنْ رَبِّكَ پھر کر تم میں سے دولتمندوں ہی کے لینے دینے میں رہ جائے (حشر ۱)

اس کے بعد اس سلسلہ میں دو تہذیب کی سرچے بڑی بیماریاں کو دنیا میں انسانیت کا بدترین منظر اور آخرت میں بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشار دی فرمایا،

وَمَنْ يُؤْتِكُ شَيْئًا نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سجده - ۱)

اور جو اپنے جی کی لاپچ سے بچا لے گا وہی لوگ
میں مراد پائے والے،

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اسکی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیکنامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں اپنی شہادت کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَحْمِلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (ہود - ۴)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا
ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو

اس آیت پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اسکو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خاکن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے، اور میری شخصیت اور انسانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، اس آیت پاک کی تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیج و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے، پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت

کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا،

ثُمَّ لَنَسْأَلَنَّهُ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (نکا - ۱)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائیگا

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی دولت کو کمان اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی،

وَنَبِّئْهُمْ أَنَّمَا مَالُهُمْ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَمْ يَكُنْ لَكَ خِزْيَةٌ عَلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ
وَعَدَّ ذَكَا يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَ ۖ
کَلَّا ۚ (ہمزہ ۱۰)

نمایا، رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے، ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے، اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے، اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں، ان کو خطاب کیا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ
وَلَا يَفْقَهُوْنَ نِعْمًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۖ
وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں، اور
اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو
دروناک عذاب کی بشارت دیدو،

(توبہ - ۵)

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے، (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں، لیکن اہل راز و سیاہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مسئلہ کی پوری گہرہ کھود دی، حضرت موسیٰ کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی

سلسلہ بخاری کتاب العلم باب (۱) اعتبارنا فی العلم والحکمت،

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبقتوں کے موافق، اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے، اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے، جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے، اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کر دی ہیں، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد بہت کے شہروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہی تک پہنچنے کی کوشش کریں،

حضرت شیخ شرف الدین نجفی منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں،

”وایں طائفہ جان و مال در باختہ نہ
 و با بیج کس ماسوا اللہ نہ پرداختہ اند، گفتہ ایشان
 است، الفقیر مالہو مباح و دمنہ ہدکا
 یعنی درویش صادق آن بود کہ بخون و مال
 اور ادعوی نبود۔۔۔ اگر ماش بر مذخوش گرد
 گوید احمد لشد کہ حجابے از پیش من برداشتند
 تا گفتہ اند، زکوٰۃ نعمت دنیا نزدیک اس طائفہ
 محمود نباشد، از آنکہ نخل ناستودہ است، و غنای تمام
 باید تا دولست ورم را در بند کند، و یکسال جیسو
 داد و آنگاہ پنج ورم از اس بد ہد،
 اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے
 اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا، اس کا مقولہ
 ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقت اور جہا
 خون معاف ہو، اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعو
 نہ ہو۔۔۔ اگر لوگ اس کا مال اٹھا لیجائیں تو خوش
 ہو کہ احمد لشد اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک
 پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا، یہاں تک کہ ان کا کہنا ہے
 کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا
 نہیں ہے کیونکہ بخلالت تعریف کے قابل نہیں
 اور اس کے لئے کہ سال میں دو سو ورم جمع ہوں

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے،

یکے از فقہاء برہیل آزمایش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را
کسی نے حضرت شبلی سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے
پر سپید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید، گفت جواب ہر
مذہب فقہاں خواہی، یا بر مذہب فقیراں ؟
گفت بر ہر دو جواب فرما شبلیؒ گفت، ہر مذہب
فقہاں از دو سیت درم بعد از عولانِ حول پنجم
باید داد، و بر مذہب فقیراں در حال ہر دو سیت
درم باید داد و جان بشکرانہ بر سر باید نہاد، فقہ
گفت ما این مذہب از دئمہ دین گر قتم شبلیؒ گفت
ما این مذہب از صادق رب العالمین گر قتم یعنی
ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ، او ہر چہ داشت پیش
سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشہ خوشین
بشکرانہ داد، (مکتوب ۳۴ - سہ صدی)
کو شکرانہ دین دیا،

حمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ کے پاس عمر بھر کبھی
اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں رات کو سونے
چاندی کے چند خزانے ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر میں آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لئے اپنے مسک کو فرض
نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجاست کا
دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے، اور اس لئے تاکہ بے قیدی عدم پابندی کوگون
کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو، مقدار معین کے مالک پر ایک رقم کا نفاذ فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معذور

افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے،

اشتراکیت کا علاج | دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور میں، قوم کے مختلف افراد کے درمیان، دولت کی غیر مساوی صورت لگنی طور سے پیدا ہو جاتی ہے بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا، اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا، اور سونے کیلئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی اور دولت مند طبقوں کی خود غرضی خود پسندی، عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور تنگ بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک پتھر تک دینے کے روادار نہیں ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت، خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی و کوشش اور درست و بازو سے حاصل ہوئی ہے اس لئے ان سست فائز افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں، قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا، تو اس نے جواب میں یہی کہا، اِنَّمَا اُوْتِيتُنِيْ عَلٰی عِلْمٍ عَلِنَدِیْ (قصصہ) مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہی یہ سب ملا ہے،

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے،

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ تباہی میں یہی آب و ہوا، اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے، اور توشلزم، کمیونزم، انارکزم، اور باشوزم، کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے، یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے واسطے، جو نقشے بنا رہے ہیں، وہ انسانی فطرت و طبیعت کے اس درجہ مخالفت ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے،

محترم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متفقہی ہے، دولت و

سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے، سود کو حرام قرار دیا، متردک جائداد صرف ایک شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دیں، قیصریت اور شہنشاہت کے بجائے جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی، انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو یکسر تمام انسانوں میں بڑے تقسیم کر دیا جائے، تاکہ دنیا میں کوئی لنگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا، کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے، یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اُستے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق، کہ جو لوگ سونا چاندی کا ڈکر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دیدے، اور شام کے دولت مند صحابہ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دیکر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذر کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و سائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیر است کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا،

اقتصادی اور تجارتی فائدے | زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی

لے مسند ابن عباس، جلد دوم، صفحہ ۱۷۵، فتح الباری شرح بخاری جلد ۱۰، طبقات ابن سعد، ترجمہ عمر بن عبد العزیز ص ۱۷۵

فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اور گنہگار چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صنفیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چندان فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، اور نموسے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جو اہرات اور دیگر قیمتی مہر فی پتھروں میں یا غیر ضروری زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دین ورنہ اہل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائیگی، جس کو فطرۃ کوئی برداشت نہیں کر سکتا، مگر زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دیجائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑیگی تو وہ کوشش کریگا کہ جہاں تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے، اور اہل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جنہیں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائیداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے، صحابہ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو تینوں کے سرمایوں کے متوالی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے باغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے، یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ
اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گار کر رکھتے ہیں

وَلَا تُبْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبُخْسًا رَهِيمًا ۖ

اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، لہٰذا

بَعْدَ آيَاتِهِمْ (توبہ - ۵)

سخت دردناک عذاب کی بشارت دو،

یہ "دردناک عذاب" قیامت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا میں بھی ان کیلئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں، اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے، اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذابِ الیم میں مبتلا کرتے ہیں، اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں، اس لئے امرار کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں،

فقر کی اصلاح | اب دوسری طرف فقر الکاگردہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شاریین مذہب نے انسانوں کے اس قابلِ رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر حقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اُس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے، کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے، اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہ نہیں رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قلعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اس کے ہاتھ باندھ دیے گئے، اور مرہم میں اس زخم کو سہرا یا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے، اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کیلئے، ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں، اس نے اس ننگین اور درد مند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے، اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشائیں اور علی امداد و اعانت

کی تدبیریں ہیں جو اُس کے دل کی ڈھارس، اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں، اور نشر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو نہایت بستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگرہی، اور ان کے سہارے بچنے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں، اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی، لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے،

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو، نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم و محبت کا نہایت بلند منظر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تھویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دو ملتہ دون کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دیدینے کی ترغیب دے رہے ہیں، اور اس سے دینے والوں کے جذبہ انثار اور اُن کے جو دوسرا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو، گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی بستی، اور دوسرے کے سہارے بچنے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں، اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں اس طرح اُن کے لئے گداگری، نہایت بستی، ذلت، سفلی پن، کم ہمتی، نامردی، اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام خجائیں اگر جمع ہوں گی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

یہ غیر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں، غریب و امیر اور مسکین و دولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا، بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پٹروں میں رکھ کر برابر بائٹ سے ناپا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے، یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیوں کے خاتم اور دونوں کے کتب علیہ السلام کے سوا

دنیا کے کسی اخلاقی معلم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلوں کو برابر رکھ سکا، اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں، تو انسانی جو ہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امر اکا طبقہ اپنے اخلاقی محاسب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک، اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہمتی مایہ ہو جائیگا، اور اگر غریب اور فقرا کو ہر قسم کی گداگری اور دیوڑھ گری کی اجازت دیدی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائیگی، اسی لئے داعی اسلام علیہ السلام نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا، اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے تقاضے اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا،

أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَكْ، (ضحیٰ - ۱) مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے،

دوسری طرف خود دار و بے نیاز فقرا اور غریبوں کے طبقہ کی مدد فرمائی،

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْقُفِ، ناواقف ان کی خود داری اور سوال کی ذلت

تَعْرِفُهُمْ سِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ سے بچنے کے سبب ان کو دولتمند سمجھتے ہیں، تو انکو

الْحَافَا، (بقراءۃ ۳۷) اُن کی نشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے لپٹکر

نہیں مانگتے،

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر چلے جاتے تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے

وَنَزَّوْدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى، اور زاد راہ بیکر چاؤ کہ بہترین زاد راہ تقویٰ

(بقرہ - ۲۷۵) (بھیک نہ مانگنا) ہے،

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسنِ اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو خالی

مت لوأؤ، وَاَلَوْ بِشِقِّ تَمَرَةٍ" اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیون نہ ہو" دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خود داری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کہی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الیدُ العلیا خیر من الید السفلیؑ" اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معور کیا، اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع ہم پہنچایا۔

صدقہ و خیرات و حقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لیکر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلوین لے لیکر پیئے لگتے ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
ان هذه الصدقات اما هي اصلاح الناس
یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے،

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو فطر آجائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگوں کے دونوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے،

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں، ان میں سے کوئی چیز ہے جو غیر مستحق، انہاء اسبیل، فقر، اور مذہب گداگروں کا تنگے امتیاز نہیں، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقر، اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنا دیتا ہے تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرۃ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جنہیں نفس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے، گندہ سے گندہ اور میلے سے میلہ پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے بدل

لے بخاری کتاب الزکوٰۃ باب انما انما ویشق مرة لہ ایضا باب الاستغاث عن المسئلة لہ سلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل البنی علی الصدقة.

کرنے کی اجازت دی جائے شریعتِ محمدیہ نے اسی اہول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے معینہ تدابیر اختیار کی ہیں، اور چند بہت مناسب احکام جاری کئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خاصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے، نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی، اور دمارِ ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خود داری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے، اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ نشاۃ اس کی یہ اخلاقی جس غیرت اور شرمندگی کا شرفیافہ جو ہر ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے، یا ان میں بڑے ظرف کے شریف نفس لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے، اپنی جان پر کھیل نہ جائیں،

اسلام نے انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

إِنَّمَا نَطْعُكُمْ لَوْحِدِهِ اللَّهُ لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ

ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں ہم تم سے کوئی بدلہ

اور شکر یہ نہیں چاہتے،

جَزَاءً وَلَا شُكْرًا، (دھو۔ ۱)

اس شرفیافہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گزاری بھی نہیں چاہئے، پھر صدقہ دینے والوں کو یہ بھی تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے، یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے کے تمہارے اس عظیم انسان کا نامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی، اور تمام ثواب صرف غلط کی طرح تمہارے نامہ اعمال سے مٹ جائیگا، فرمایا،

جو لوگ خاک کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں،

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مَا الْفَقُّوْا مَّا وَلَا آذَى
اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ طعنہ دیتے
ثُمَّ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
ہیں ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہو
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرٌ
اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے، اور نہ
خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا آذَى وَاللَّهُ
وہ غمگین ہونگے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی
غَنِيٌّ جَلِيْلٌ

کر کے سائل کو مال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے
جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے
خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے
ایسے کاموں پر بردباری سے درگزر کرنے والا ہے

(بقہ - ۲۶)

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دلنشین تشبیہ سے واضح کیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ
مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر، اور طعنہ
بِأَمْوَالِكُمْ ۖ أَلَا تَعْلَمُونَ أَنَّهُ يُغْفَرُ لِمَا سَلَفَتْ
دے کر، برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو
سَاءَ مَا لِلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
بربا کرتا ہے جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا
الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ
ہے، اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا،
فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ
اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر
عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي
کچھ گرد و پری ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا
الْفُقَرَاءَ الْكَافِرِينَ،

ہو، جس نے انکو صاف اور ٹھیل کر دیا کہ اب اُسپر
کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا
اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خدا کافروں کو م

اس بات پر آمین

(بقہ - ۲۶)

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے

خود کسی کو نہ دین، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں، اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا گمراہیٹ مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون انسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے، اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پرست رکھے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی میار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقراء اور مسکینوں کو در بدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی، اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے،

۲۔ اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے، کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فضل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی، اور اس لئے اس کا ڈرتھا کہ اگر اس کا انداز نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری، اور یوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشے کی اشاعت کا سبب بن جائیگا اور یہ اخفاء اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے، کہ دینے والا، ناپیش اور شہرت طلبی کی آلاشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہتر صدقہ وہ ہے کہ دہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو"۔

لے مجمع مسلم الی لا لوفہ
باب فضل اخفاء
الصدقۃ

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کر کے شمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا،

اِنْ تَبَدُّوا لَاصَدَقَاتٍ فَمِیْہَا حَیْ وَاٰتٍ
تُخْفُوہَا وَتُؤْتُوہَا الْفُقَرَاءَ فَہُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (بقرہ ۲۷۱)

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کیساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ

اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے، اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عبد نبویؑ میں تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اس لئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقروں کو دو تو چھپا کر دنیا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت مست رہے، اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے، اس میں فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہیں، اور بھان اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے، اس لئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے، کہ اگر بیت المال اور نائبین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے، اور تمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے، لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں، اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ ہیچ میں نہیں ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو تاکہ دینے والا ناپیش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب، اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوق اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ کرام کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کاظم سیاہ نہ کر دیئے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضایہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچنے نہ ٹھہرے، اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں بیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ بہتدل اور ادنیٰ درجہ کی

چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کالاج اور چھوہ پن پیدا ہوگا، کہ معمولی اور سٹری گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بنالت، حرص اور کینہ پن، اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دینے کا منشا دوسرے کی مرد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سٹری گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجور دن کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں دنگا دیتے تھے، اور جب وہ گردہ بھوک کی شدت سے بیاب ہو جاتا تھا، تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ
وَلَا تَتَّبِعُوا الْخَبِيثَاتِ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَكِنَّكُمْ
بِأَخْذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِوْا فِيهِ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ غَفِيرٌ حَكِيمٌ

مسلمانو! اپنی کائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان میں سے ردي مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالانکہ اگر وہی تم کو مایا جائے تو خود تم نہ گے لیکن یہ کہ تم پر پشی کر جاؤ، اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے، اور وہ خوب بین

والا ہے، (خوب بین ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

(نقصہ ۳۷ - ۳۸)

۳۴۔ فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگ دستی اور بے ہمتائی کے خود داری اور قناعت کو ہاتھ

سے جانے نہیں دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے، لیکن ان کی خود ری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا،

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ صدقہ ان فقر کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں
لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ گھرے ہوئے ہیں، (بغرض معاش و تجارت) سفر
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ النَّعْمِ کی قدرت نہیں رکھتے، جو لوگ ان سے نعمت
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ ہیں خود داری اور عدم سوال کی وجہ سے انکو
الْحَقَّ، مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف ان کے بشرہ سے انکو

پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں کہتے (بقرہ - ۳۴)

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی و در در کی ٹھوکر کھاتے ہیں، اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں،

۵۔ لیکن با این ہمہ حرم و احتیاط اگر گداری و حقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی، اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اسکی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے، انھوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھئی کسی سے نہیں کہتے تھے، کہ اٹھاؤ، ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بوسے میں یہ

لے ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراۃ المسلمۃ

ضمانت کرتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے،

حکیم بن حزام ایک صحابی تھے، انھوں نے ایک دفعہ آنحضرتؐ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صدمہ پیش آئی تو فرمایا اسے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیرین اور خوشترنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لیگا اس کو اس میں برکت دی جائیگی، اور جو لالچ کے ساتھ لیگا، اس کو برکت نہ ملے گی، اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھانا چلا جائے اور اسکا پیٹ نہ بھرے، اور کچھ ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہتے اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے۔

اس کی اور متحدہ مثالیں ہیں، اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں، یعنی جنکے ہاتھ پاؤں، اور آنکھیں، صحیح و سالم ہوں بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی، فرمایا کہ

لا تَحْتَ الْمَسْئِلَةِ لِرَجُلٍ قَرِيٍّ، وَلَا
لذِي مَرَّةٍ سَوِيٍّ (ترمذی)

طاقت اور سکت والے اور صحیح و سالم آدمی کیلئے

بھیک مانگنا حلال نہیں،

صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا،

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَأْخُذُ أَحَدٌ

حَبْلَهُ فَيَحْتَطِبُ عَلَيَّ ظَهْرًا وَلَا خَيْرَ لَهُ مِنْ أَنْ

يَأْتِيَ سَجْدًا فَيَسْأَلُهُ أَعْطَاهُ أَوْ مَضْمَنًا

(کتاب الزکوٰۃ باب الاستعانة عن المسئلة)

جو تمہیں کسی کا رشتہ نیکر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا

بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے

بھیک مانگے، وہ اُسے دے یا نہ دے،

ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب کرامۃ المسلمین صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعانة عن المسئلة،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپ نے فرمایا
تھامے پاس کچھ برتن کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپ نے انکو منگو کر نیا لایا اور ان کی قیمت سے ایک
کھٹائی خریدی، اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ، اور بیچو، انھوں نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو
یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کٹے بچ گئے،

۴۔ لیکن جو لوگ ہمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے، ان کو بھی الحاح کثرت سوال، ہجرت اور
گڑا گڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ مانعت کی، آپ نے فرمایا،

ليس المسكين الذي تودع الاكلة مسكين وہ نہیں ہے جس کو نفع دے دو لقمے دروازوں

والاكلان ولكن المسكين الذي سے واپس لوٹا دیتے ہیں مسکین وہ ہے جو گو

ليس له غنى ويستقى ولا يسأل الناس بے نیاز نہیں ہے، لیکن جیسا کہ ہے اور لوگوں

الحافا، (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول الله سے گڑا گڑا کر نہیں مانگتا،

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں
انسان کی شرم و حیاء غیرت و آبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا،

ما زال الرجل يسأل الناس حتى ياتي آدمی ہمیشہ مانگتا پھر تا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت

يوه القیامتہ لیس فی وجہ مضغۃ کے روز اس طرح آئے گا، کہ اُس کے چہرہ پر گوشت

لحمہ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سال الناس تکلفا) کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا،

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت و آبرو کی رونق خود دھو دی

ان ضروری اصلاحات کیساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیوں اور بد اخلاقیوں
کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں، اور ساتھ ہی انسانی برادری کے

دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا، پست و بلند کے نفرتوں کو ممکن حد تک کم کر دیئے، اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکون سے اس کو ڈرایا کرتی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین ملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی کہ کوئی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لیکر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے، اور تیسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا، کہ زکوٰۃ کے کسی مصرعہ مصروف کے لئے کسی محسوس نہیں ہوتی تھی، ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا، اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر داد و سند کا راستہ کھلا ہوا تھا،

روزہ

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقراءہ)

روزہ کا مفہوم | روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو "صوم" کہتے ہیں، جس کے تقطعی معنی "رکے" اور چپ رہنے کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق، قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں "صبر" بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی "ضبط نفس" ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں، ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہواؤ ہوس اور ہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈمکادینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابطہ اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا منظر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا اور پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مذہب متینہ تک رُکے رہنے کا نام شرمِ روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کیساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی، خواہش کے نزدیک و دور کی حقیقت میں داخل ہے،

روزہ کی ابتدائی تاریخ | روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں، انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پر سپرینس آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی مثال اور استقرار کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتداء اصل میں اس طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بخود کے رہتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے گئے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوں کو پہنچ جاتا ہے، لیکن یہ قیاس اباب خرد کی نگاہ میں سند قبول عمل نہ کر سکتا۔

لے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹، طبع گیارہ

بہر حال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے،
 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ
 كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
 تَتَّقُوْنَ (نقہ ۲۳۵) ہوں،

شہرِ رمضان الذی اُنزل فیہ القرآن
 ہدی للناس و یبیین من الہدای
 والفرقان فمن شهد منکم الشهر
 فلیصمه ومن کان مریضاً او علی سفر
 فعدّہ من ایام اخر، یرید اللہ بکم
 الیسر ولا یرید بکم العسر ولینکم
 الیعدۃ ولتکبروا للہ علی ما هدکم
 ولعلکم تشکرون،

ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل آیا
 جو انسانوں کے لئے سہا پہا ہدایت کی دلیلیں
 اور حق و باطل میں فارق بنکرا یا، تو جو اس رمضان
 کو پائے وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو یا
 سفر پر ہو، وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے، خدا کی
 چاہتا ہے سہولتیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری
 کر سکو، اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تاکہ تم خدا
 کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو، اور

(نقہ ۲۳۶) تاکہ تم شکر بجالاؤ،

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی نسبت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں،

روزہ کی مذہبی تاریخ | قرآن پاک نے ان آیتوں میں تشریح کی ہے کہ روزہ اسلام کیساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر اسی جو بقول مخالفین عالم کی

تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ
تائیدِ حجت پر مبنی ہے، تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں
یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون لکھا: روزہ (فاسٹنگ) لکھتا

”روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت و تہذیب، اور گرد و پیش کے حالات
کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن ہر شکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے
مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔“

آگے چل کر لکھتا ہے۔

”گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔“

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں،
ہر ہندی ہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس روز
ہوئے، بعض برہمن کا تک کے مہینہ میں ہر دو شنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کنفی کرتے ہیں، یعنی چالیس
دن تک اکل و شرب کے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت
شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے بیان ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن میں ہر سال
جینی کئی کئی مہینہ کا روزہ رکھتے ہیں، قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر
آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں تھیسوفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں، پارسی مذاہب میں گو عام
یہودوں پر روزہ فرض نہیں، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم
اُن کے ہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لئے تو چھ ماہ روزہ ضروری تھا،

یہودیوں میں بھی روزہ فریضہ الہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے

لے ان تمام حوالوں کے لئے دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳/۱۹۴ طبع یا زدم

(خروج، ۳۴، ۳۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں، لیکن چالیسویں دن کا روزہ ان پر فرض ہے، جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے، اور اسی لئے اس کو عاشوراء (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشوراء کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰ کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے، اسی لئے تو رات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے، اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی تبصریح مذکور ہیں، عیسائی مذہب میں اگر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا، حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے، اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی، یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں، بہت سے روزے بڑھائے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے، اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اس اور نگین بنالیتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے اگر حضرت عیسیٰ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا،

”کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولہا ان کے پاس

ہے روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا، تب انہیں

دنوں میں روزہ رکھیں گے“ (مرقس ۲-۱۸)

اس تلخ مین دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور عاری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں،

۱۔ تورات، سفر الاخبار ۱۶-۲۹-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰
۲۔ ۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰

انہیں نفردن سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے بہتدعا نہ روزوں کو منع فرمایا، انہوں نے خود اپنے پردون کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں،

”پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اور اس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بکاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پھر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہو، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے کو اسٹکارا بدلہ دے“ (متی ۶: ۲۳-۲۴)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکل سکتے ہیں، وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

”یہ جنس سوا سے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی“ (متی ۱۷: ۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، کہہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشوراء (یعنی دسویں محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے، کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ میں یہود اپنا عاشوراء الگ مناتے تھے، یعنی وہی اپنے ساتویں ہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے،

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِكُمْ، (بقرہ: ۱۸۳)

پہلویوں پر لکھا گیا،

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت | انسان کی ہر قسم کی روحانی بے بنیادوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے،

تو آخری نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اسکے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں، اخلاق جسکا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کیجائے، تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوں کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤں کی ایک بھٹی ہے اور جو ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالیشان عمارتوں، لذتِ غذاؤں اور تیز رفتار سوار یوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند و عیال، زرو مال اور غم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا؟ پادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی ہے، اور زندہ رہے ہیں، بروایت عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پرستار و حافی زندگی بسر کی خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو نقطوں میں محدود ہو کر رہ جائے، اور وہ مایہ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سیدہ رقی پر موقوف ہے، اور سیدہ رقی صرف کھانے کے چند نعمتوں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا انہیں چند نعمتوں اور چند گھونٹوں میں افراط و سعت تفنن اور تفریش کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالمِ ناسوت اور عالمِ ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فرق و امتیازات کو محیط ہوگی، انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی نسبت اگر تیار کیجائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈے جائیں، تو انہیں دو چیزوں

کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی،

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب حرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے، کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج یا بعد ہیں اگر طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعۃً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی نامکن ہے، اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے، اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغناء کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے، مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ملا راہی کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہئے، اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدا سے پاک کی اطاعت و عبادت ہے، اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ ”تقویٰ“ سے بے نقاب کر دیا ہے، اور چونکہ روزہ کی حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر دیا ہے،

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

مسلمانوں: تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلے انہوں

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ ۱۸۳) پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو،

روزہ کی غرض و غایت ”تقویٰ“ ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا، اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچالینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا، لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے،

لِشْكُرِهِ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

کر اور شکر ادا کرو،

(لقبہ ۵-۲۳)

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑیگا،

رمضان کی ماہیت | یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ ذہر انسان کے لئے قائل ہے، اسی یقین کیساتھ طلب روحانی کا وقت کار کرتا ہے، کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا طور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیوں کروا جبرۃ الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیونکر وعدہ کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب کا میاب ہوتے ہیں انہیں سے ہر ایک خیر مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے، قرآن مجید میں تیرہ مقام پر ”سنتہ اللہ“ کا لفظ آیا ہے، لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے،

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصول قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں،

پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیّت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالم انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الہی کا سرشار بہہ مچھلنے لگتا ہے، کوہ سہیل کا پر جلال پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب توراۃ لے لے جاتا ہے تو چالیس روز تک

میں یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) نزولِ وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سرسبز و رہنا تمام پروانِ محمدی کیلئے ضروری تھا کہ

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو،

(ال عمران - ۴۶) خدا تمہیں پیار کرے گا،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہِ اقدس میں بقدر امکان انہیں حالات و جذبات میں متکیف ہونا چاہئے، جس میں وہ حالِ قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات و حالات جبکہ قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے سنے پر ہماری شکر گزاری اور خدا کی بڑائی ہے،

فریضۂ صیام کا مناسب موقع سنیہ

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا، اور ان سے صرف جسم کی ریت مقصود ہوتی، تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا

نام ہے، اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے، اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی تھی، ظہورِ اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا، اس نے ان کو عرب کے سموی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت صلیم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لئے تھے، اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لئے موزون ہو سکتا تھا، نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا، لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جبکہ استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراضِ روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں، یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قوائے شہوانیہ اور

زخارف دنیا کی شگفتگی اور لذاتِ حسیہ کے انہماک و تغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، کہہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے، بلکہ خود کفار کے جو رسوم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا، اس لئے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات لی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو وجہ کفایت سے بے نیاز کر دیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا یا غریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آکر ان کو اپنا فریفتہ بنائے، اس لئے حقیقت یہ تدبیر کا موسم تھا جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی، اور وہ پرہیز روزہ تھا، جو سترہ میں فرض ہوا، اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض نادانوں کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کو روزہ کا غور کیا گیا، حالانکہ اصول اسلام کے رو سے فاقہ مستون کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیروں کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لئے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز، اور احکامِ قرآنی کے غور ہو چکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزون تھا۔

ایامِ روزہ کی تحدید | روزہ ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورے سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت

لے تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۸۷۷ و زرقانی برہان ۱۰۱ مصر و زاد المعاد ابن قیم جلد اول ص ۱۳۷

تھی تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لئے وہی زمانہ موزون تھا جس میں خود قرآن نازل ہوا شروع ہوا یعنی رمضان، چنانچہ انھیں صلہ اس کے بعد جب تک زندہ رہے، اور تمام صحابہ نے یہ عینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا، اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی عینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے، اور پورے عینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے، چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ کو اٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تَقَرَّبَ إِلَيْهِ (۲۳)

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (بقرة ۲۳) جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا،

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا،

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (بقرة ۲۳) چند گئے ہوئے دن،

مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس مبلغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے، اور فرمایا "چند گئے ہوئے دن" اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے،

فَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرة ۲۱۰) کی گنتی،

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہونگے، کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا تو یہ کتنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو۔ نیز یہ بھی اشارۃً تہ چلتا ہے

کہ جو دن ہو گئے وہ گئے ہوئے مقررہ ہو گئے، ورنہ معدودات (گنے ہوئے) اور معدودات (گنے ہوئے) میں آیا ہر آخر،
(دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ویشکملوا لبعثۃ (تاکہ تم شمار کو پورا کر لو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے
بعد دوسری آسانی بتائی،

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامُ
مُسْكِينٍ، (نمبر ۲۳-۲۴) کا کھانا فدیہ دے،
اور جو پیش روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین

اب کہا جاتا ہے کہ اگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے،
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لِّهٖ وَاَنْ تَجُوعُوا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (نمبر ۲۵) اُسکے لئے، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو
ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا، اور روزہ
کی اہمیت ظاہر کی،

اتنی تہیدوں کے بعد روزہ کے گئے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے، کہ وہ ایک ہینہ ہے، اور
جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ، چند گئے ہوئے دن، ظاہر ہے کہ
سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں انتیس اور تین دنوں کے روزے چند گنتی کے دن تو ہیں ہی، بہر حال

لے عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ آیا جمع قلت ہو جبکہ اطلاق اس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اسکو چاہئے کہ آیا ہر
العرب کو جرحہ اور میں سینکڑوں ہیں، زیادہ سے زیادہ نو پڑا یوں میں محدود کرے، اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہان دنیا
کے اور ہزار انقلابات کو آیا ہر اللہ کہا ہے (براہیم - ۱) ان کو تو تک کے انقلابات عالم میں محدود کرے، یں سے شام تک کے سرسبز
کو جو ہینہ یں سے ہوتے تھے اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا، سَيَوْمًا مِّنْ اَيَّامٍ اَمِينٍ،
(سبا - ۲) اور فی الايام الخالیدہ (گذرے ہوئے دن) جبکہ اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر، اور تک الايام ہند اولہا میں
انسان کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ جڑ سکیں، جمع قلت و کثرت کا یہ قاعدہ وہ بھی کلی نہیں بلکہ عمومی
ان الفاظ کے لئے ہے جن کی جمع قلت و کثرت دونوں متصل ہیں، آیام کا لفظ ان میں نہیں اسکی صرف ایک ہی جمع آتی ہے، اور وہ انوار
جو تعبیل کے بعد آیا ہر بولا جاتا ہے، سند کے لئے دیکھو رضی شریح کا فیہ، جلد دوم بحث جمع کثیر اور لسان العرب لفظ یوم،

رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا،
 شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
 هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ
 قرآن میں لوگوں کے لئے ہدایت ہے، اور ہدایت
 وَالْقُرْآنِ ، (رقبہ ۲۲-۲۳)
 اور حق و باطل کی تیز کی دلیلیں ہیں،

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں
 جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کئے گئے ارشاد ہوا،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (رقبہ ۲۳)
 اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین و تحدید اور ایاماً معدودات کی تشریح ہو گئی،
 عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرفِ زمان ترکیبِ نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرفِ
 زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے صَادَ شَهْرًا اُس کے یہ معنی
 نہ ہونگے کہ مہینے میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائیگا، اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے
 ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے صَادَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا
 کہ اس آیتِ پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ ”شہر“ یعنی ”مہینہ“ کہا گیا ہے،
 اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جس کا عرب
 میں رواج تھا، اس کے مہینے کبھی تین اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہیں جیسی روایت ہو، وہی ماہِ صیام پر
 بھی صادق آئے گا، جیسا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰت تمام صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور جمیع فرقِ اسلام
 کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے، اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں،

ایک نکتہ قرآنِ پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے،

لے تفصیل کے لئے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ و ظرف زمان ۱۶۲، مطبع نوکلنور ۱۸۷۵ء

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ-۲۳۸) تو جو اس مہینہ کو پاسے، تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے،

لفظ شہد کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں جو اس ماہِ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ماہِ صیام آئے، اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہِ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے شخص اپنی جگہ پر موجود ہوا مگر ماہِ صیام کا وہاں گزر نہ ہو، یہ صورت ان قطعاتِ ارضی میں پیش آئیگی، جہاں شبِ دروز کا وہ نظام موجود نہیں جو باقی متمدن دنیا میں ہے، مثلاً جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں، کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں، ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں، تو یقیناً متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار بنا کر روزے رکھیں اور کھولیں، (جیسا کہ حدیث و جال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے)

اسی طرح وہ ملک جہاں میں گھٹنوں کی راتیں ہوں، اور لوگ روزہ کا کھل نہ کر سکتے ہوں، آیت
وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ، (بقرہ-۲۱۷) اور جو پیشِ روزہ رکھ سکیں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہوا
پر عمل کر سکتے ہیں،

لفظ اطاقۃ کے معنی میں بعض صاحبوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ اس کے معنی صرف توانائی و وسعت اور قدرت کے ہیں بسببِ قدرت اور طاقت رکھنے کے نہیں ہیں، مگر یہ صحیح نہیں، اطاقۃ طاقت کا باب افعال سے مصدر ہے، اس کا ثلثی مصدر کم استعمال میں آتا ہے، اور طاقت کے لغوی معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں،

والطَّوْقُ الطَّاقَةُ اِىْ اَقْصَى غَايَتِهِ، و طرق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی

ہو اسم مقدار ما یمکن ان یفعلہ، غایت، اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی

بمشقہ منہ،

شفقت کے ساتھ کر کے۔

حضرت ابن عباسؓ غالباً یہی معنی قرار دیکر حاملہ اور مرضہ (دودھ پلانے والی) اور بڑے کو فریفت سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب | علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی، جو عام عبادات و پرستش کی غرض غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہمارے جہانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جہانی رحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گولن، شنگاہین، موجود ہیں، چنانچہ جو گیون اور بینیون میں روزہ کی غیر معمولی مذمت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے "نفس کو رکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ متحمل ہو، سفر الاحبار (۱۶-۲۹) میں ہے:

”اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ

تمہارے دیں کا ہو، خواہ پر دہی جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے۔“

تورات کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے۔

”اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو، اور

کچھ کام نہ کرو۔“

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے برفظ استعمال

کیا ہے وہ ”صوم“ ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام

کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جان روزہ کا حکم دیا ہے،

یہ الفاظ بھی اضافہ فرمادیئے ہیں،

لے ابو داؤد و کتاب الصوم باب من قال ہی مبتدئ یسبح و یصلی،

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ
خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں

بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ-۲۳)
چاہتا،

اسلام کا عام قانون ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا،
خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف

(بقرہ-۲۸۰) نہیں دیتا،

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے،

يَا مَرْهُمُ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ
وہ ان کو نیکوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے

وَيُحَذِّرُ لَهُمُ الطَّبَائِبَ وَيَحْذَرُ عَلَيْهِمْ
روکتا ہے، اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے، اور

الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ
اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی

الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف-۱۹) ہیں، ان سے اتارتا ہے،

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے

انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے، اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی اُن

سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں، بتدریج کم کر دیا،

روزہ میں اصلاحات | اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں، حسبِ فیہ میں

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان میں اکثر روزہ صرف پیروں

کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے

بیان صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ کہ

کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے،

اسلام میں پیشوا، غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیروں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی

چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (تبقہ-۲۳) اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں، تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہیں، اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے،

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالتِ انسانی کی تخصیص و استثناء نظر سے نہیں گزری، تو رات میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائیگا یا قتل ہو جائیگا، بلکہ یہ ہے کہ اس پر دیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گوہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس اگر رہا ہو، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے، مستثنیٰ ہیں، عورتیں آیامِ حل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، بیمار اور مسافر، مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃ قادر نہیں مستثنیٰ ہیں، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالتِ سفر اور غدر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں، اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ

اگر تم میں کوئی بیمار یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھے، اور وہ لوگ

فِذَیْہُ طَعَامُ مِیْسِکِیْنِ (بقہ ۴-۲۳) جو ہنشل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا

ترجمہ میں ہے،

عَنْ اَنَسٍ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ

اِنَّ اللہَ وَضَعَ عَنِ الْحَامِلِ وَالْمَرْضِ لَصَوْمَہِ وسلم نے کہ خد نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے

روزہ انار لیا،

۴۔ اور مذہبون میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتقدانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پہل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسیٹ اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں گوہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی،

۵۔ جینیون کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثُمَّ اَتَوْا الصَّیَّامَ اِلَى الْاُتْمَلِ (بقہ ۴-۲۳) پھر روزہ کو رات تک ختم کرو،

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ تھا کہ روزہ کو نئے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتداء اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئیں، وہ سوچے تھے، اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے دن پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آگیا، اس پر یہ آیت اتری،

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَمِينُ ۖ

وَمِنَ الْخَيْطِ الْأَمِينِ مِنَ الْبُهْرِ، (بقہ ۲۳-۲۴) خطِ صحیح کے سپید خط سے متوازن ہو جائے،

۷۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میان بیوی علیحدہ رہتے تھے لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اسلئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی، اور رات کو اجازت دیدی،

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ

روزہ کی شب میں بیویوں سے معاشرت تمہارے

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۚ عَلِمَ اللَّهُ

لئے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم انکی

أَنْتُمْ كُنْتُمْ عَنْتَهُنَّ ۚ أَنْفُسُكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ

خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے

وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَاَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّكُمْ كُنْتُمْ عَنْتَهُنَّ ۚ وَأَنْتُمْ

تو اس نے معاف کیا، اب بیویوں سے طہ طہا اور

مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ، (بقہ ۲۴-۲۵)

خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے، (یعنی

اولاد) اس کی تلاش کرو،

۸۔ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ وار کچھ کھا پئیے

یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا،

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَنِ أَكَلَ أَوْ شَرِبَ نَاسِيًا

ابو ہریرہ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پیے تو

فَلَا يَفْطَرُ فَإِنَّمَا هُوَ زَرْقٌ ۚ (ترمذی)

اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہے

۹۔ اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوتے، بلکہ بلا ارادہ

از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا،

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَفْطَرُ مَنْ قَاءَ وَلَا

پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو سٹے ہو گئی، یا سوتے ہیں غل

مِنْ احْتِمَالٍ، (ابوداؤد)

کی ضرورت پیش آگئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا

لکھنے والے کی
فہم خفی میں کئی
صور میں ہیں ان
میں سے بعض پر
روزہ ٹوٹ جاتا
ہے اور بعض میں نہیں

۱۰۔ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے اس لئے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: ”پھر جب تم روزہ رکھو، رہا کارون کے مانند اپنا چہرہ اور اس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر کھنپا لگا، اور منہ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، اسکا راجہ بدلہ دے، (متی ۶-۱۶)“

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لئے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا، اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور سواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے ظہار اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پرگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ مہنہ نشینی خوشی اور رضامندی اور مسرت ظاہر ہو،

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کو صرف استجاب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً مانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا،

ایکم مثلی انی ابیت لیطعمنی سرجی و یسقینی تم میں مجھ سا کون ہو؟ مجھے تو میرا خدا کھانا پلاتا ہو،

(یعنی روحانی غذا)

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے، جب مہینہ گزر گیا تو بطور

سرزنش کے فرمایا، کہ اگر ہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا، تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔

روزہ کے مقاصد | اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربانی، محض حکم کے طور پر نہیں ہے، بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چار گانہ ستونوں پر قائم ہے، اور ان مصلحتوں اور منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے، اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا تین مختصر فقروں میں بیان کر دیئے ہیں،

۱۔ لَتَكُونُوا عَلَى مَا هَدَاكُمْ ۚ ۱۔ تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اسکی

(بقرہ ۵-۲۳) بڑائی اور عظمت ظاہر کر دو،

۲۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۚ (بقرہ ۵-۲۳) ۲۔ تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو،

۳۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۚ (بقرہ ۵-۲۳) ۳۔ تاکہ تم پر مینر گاہ رہو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)،

اور پر گزر چکا ہے کہ شریعت واسطے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی، اور تا بہ امکان کھانے پینے کی زندگی ضرورتوں سے وہ پاک رہے، اور انھوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بلا سے اتصال کے لائق بنایا، یہاں تک کہ وہ مکالمہ الہی سے سرفراز ہوئے، اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے، تب توراة کی لوحین ان کو سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے، تب تک کہ اس سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلتا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ از دین ایک مہینہ یعنی ۱۰ دن صوم

عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا،

حالِ آن کی پیری | اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰ کی پیروی میں، ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں، عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰ کی تقلید اور پیروی میں ہی چاہئے تھا، مگر انھوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰ کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اسکی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گذارین، چنانچہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ، اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر ان کے رسول

کی پیروی اور ہدایت ملنے کے لشکر یہ میں (روزہ

فرض کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا، (بقہ - ۲۳)

دینِ الہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیمِ محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک ہفتہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے،

شکریہ | یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے، بلکہ حقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکر یہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہی وہ کتابِ الہی، وہ تعلیمِ ربانی، وہ ہدایتِ روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلمات سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نچال کر ان کو لوحِ کمال

تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے، اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قسمتوں کے پائے الٹ دیئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشابہ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وَلْيَشْكُرُوا لِلّٰهِ عَلَىٰ مَا هَدٰى لَكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

اور یہ رمضان کا روزہ) اس لئے فرض ہوا)

تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی

اور تاکہ تم اس کا شکر یہ ادا کرو،

(بقرہ-۲۳)

اس ہدایت ربانی اور کتاب الہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر شکر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عید گاہوں میں جاتے، اور خوشی و مسرت کے دلولوں کے ساتھ عید کا دو گنا شکر ادا کرتے ہیں،

تقویٰ | روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ

کَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُوْنَ

(بقرہ-۲۳)

۱۔ ”تقویٰ“ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حامل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجکا معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بہے تا بانہ تڑپ ہوتی ہے، اور روزہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر قبضہ بات بھی توست کی

افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فوجیوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نوح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے؛

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھائے، اور دوسرے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فائدہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے، — ان تمام احکام پر نظر ڈالنے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں، تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدلہ غریبوں کو کھانا کھلانا، قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا، یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرہ کمزور، یا داعم المرض یا بہت بڑھے ہیں، اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے،

وَالَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامِ مِسْكِينٍ اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ

(بقرہ ۲۱۷)

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے،

فَعِدْيَةٌ مِّنْ صِّيَامٍ أَوْ صَدَقَةٌ أَوْ تَصَدُّقٌ (بقرہ ۲۱۸) تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے،

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں ان پر قربانی واجب ہے، جو غریبوں

ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، اگر یہ نہ ہو سکے تو،

فَصِيَامٌ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ (بقرہ ۲۱۹) تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات

سجده (بقرہ ۲۲۰) گھرا کر،

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لجا کر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو،

اَوْ كَفَّارَةً طَعَامٍ مِّنْ سَكِينٍ اَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ
یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر
صیاماً، (مسئلہ ۴-۱۱۳) روزے،

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر تو روزے، تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے،

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ، (مسئلہ ۱۲-۱۲) تو تین دن کے روزے،

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے، اور پھر اس کی طرف رغبت کرے، تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، (مجادلہ-۱) تو دو مہینے متواتر روزہ،

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَاطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا، (مجادلہ-۱) تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھانا،

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ و خیرات، غریبوں کے کھلانے، بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے،

۳۴۔ روزہ ہی امیرون اور پیٹ بھرون کو بتاتا ہے کہ فاقہ بین کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند نعموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوزِ جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور تیار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو

بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلیم کا حال یہ تھا، کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت بادر واد کی طرح ہوتی تھی اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے،

۴۔ انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زنا کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا مادی، اور سختیوں کا نوگر بن جائے۔ ہمارے ہر متوقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے نعل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آسنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح منہی غشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جہانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش و جدوجہد سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے،

۵۔ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں، کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے، بطی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا نہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار روزہ و مستحب روزے بھی ہیں، اگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جہانی فضیلت کی تحفہ کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو ذاتی تجربہ ہو گا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے، بشرطیکہ انھوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحر میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جہانی علاج بھی ہے،

بیماریوں کا علاج
بیماریوں کا علاج

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشتغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جاسکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کیجائے،

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی کیونٹی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تجرہ معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اٹکے کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے،

۸۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہان روزہ اور خیرات کی یکسانی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے، بلکہ تورات میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے، اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اسکو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر اسکی سکت نہ ہو

فَصِيَاہُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَتُہٗ تو تین دنوں کے روزے یہ تمھاری قسموں کا

اِيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا اِيْمَانَكُمْ کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو، اور اپنی قسموں کا

محافظہ رکھو،

المائدہ — ۱۱۲

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جاسکے تو
اَوْ عَدَلٌ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّیَذُوقُوا ذِلًّا یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا

اُمِّرَ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ سَلَفٌ، (مائدہ-۱۳) چکے اللہ نے معاف کیا جو چکا،

علیٰ ہذا اگر کوئی ذہنی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر غور نہایا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

نَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لئے دو مہینے

(نساء-۱۳) کے لگاتار روزے،

اس سے اندازہ ہو گا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے،

۹۔ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائیگی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و متعل قویٰ کو، تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ، شکم سیر معده کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قومی کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیتِ خاطر، یہ جذبات کا سکون، ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لئے بالکل موزون ہے، اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اس میں زکوٰۃ لگانا مستحب ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گویا سدا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی!

لے صحیح بخاری باب الوجی جلد اول صفحہ ۳۰۰

۱۰۔ انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی تہنیت غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا، یا یوں کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے، کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اُسکو چاہئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے، اور نہ بہالت و غصہ کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں، بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے، جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو، صحابہ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت" چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے،

۱۱۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اہل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسرے پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے،

۱۲۔ اسی اخلاص اور بے ریا کی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵، قرندی باب الصوم ص ۴۴، و ابو داؤد ص ۲۳۶، ابن ماجہ ص ۱۲۲،
 ۲۔ صحیح بخاری ص ۲۵۲، صحیح مسلم ص ۴۴، مصر و موطا امام مالک ص ۹۰، نسائی ص ۳۵۵، سنن دارمی
 صفحہ ۲۱۸، مجمع الفوائد بحوالہ نسائی صفحہ ۵۲، میرٹھ، مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۵۲، میرٹھ،
 فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۸۸،

لئے اپنا کھانا پینا اور لذذات کو چھوڑتا ہے، اس لئے،

الصوم لی وانا اجزی لہ، روزہ میرے لئے ہے اور میں اسکی جزا دوں گا،

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی غفلت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو

خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

إِنَّمَا يُؤْتِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری

(ذمر -) کی جائے گی،

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی

جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے،

۱۳۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش

کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی

خاص ہدایت ہوئی ہے،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (رقعہ - ۵) اور مشکلات پر، دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیار سی چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا

اختیار سی نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اسلئے اسکی مہارت اور

مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے

لگے ہیں،

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمالِ حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے

خطا پوشی گناہوں کی معافی، اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے،

لے صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم، صفحہ تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱ ص ۱۹۹، مصر،

..... وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ

وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالَّذِينَ

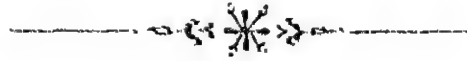
اللَّهُ كَثِيرًا وَذَلَّا كَرِهَتْ اللَّهُ لَهُمْ

مُغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا

(احزاب - ۵)

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گنا

کا بھی کفارہ ہے،



ج

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ۖ رَآلْ عَمْرٰن -۱۰

ہج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے، اس کے لفظی معنی "قصد اور ارادہ" کے ہیں، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے، انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خاندانہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھوپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی،

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل کے عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی ستقر بنا، پھر حضرت اسماعیل کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھوپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا،

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے معصوم اطفال میں دو خاص با عظمت مکان بنائے جاتے تھے، ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ دین ہوتی تھی اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی، اس کے معبد کا صحن دارالاسن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداوار میں اس میں جمع ہوتی تھیں اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی، یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیم نے نبوت پاکر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لئے تکلیفیں دیں، اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی، اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار، قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی، اور یہیں سے نکل کر وہ بین اور خلیج فارس کے ساحل سے عراق پہنچے تھیں، اور شام و فلسطین گئی تھیں، اور مصر میں کہوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں،

حضرت ابراہیم نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب شام کی سرحد کا رخ کیا، اور بجزیت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بکراجم کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر نادران کی وادی میں حضرت اسماعیل کی سکونت مقرر کی

۱۔ توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ہیں گے اور میری تصنیف ارض الخرافات میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں، ۲۔ میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہو

یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر سے مصر و شام سے جازوین اور جازوین سے مصر و شام آنے والے تاجرون، سوداگروں اور قافلہ داروں کا تالٹا لگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دُعا مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلہ کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے لئے مین تکلیف نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں یہ آسانی شریک ہو سکے، اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے یہ گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں غلہ رکھ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی،

بیت اللہ | حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنالیتے تھے، چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہیں یا "خدا کا گھر" بنانے کے واقعات مذکور ہیں،

”تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دیکے کما کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا، اور اُس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہوئے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے چچم اور عی اس کے پورب تھا، اور وہاں اس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا، (۱۲-۱۱) اس کے بعد ہے،

”اور وہ (ابراہیم) سفر کرنا ہوا دکن سے بیت ایل میں اس مقام تک پہنچا۔۔۔۔۔ جہاں اس نے

شرع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا، (۱۳-۱۲)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

”اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہیں اُسے جگہ دوں گا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا

اور عرس کے بلوطن میں جو جبرون میں بن جا رہا، اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی (۱۳-۱۴-۱۸)
 اسی قسم کی قربان گاہیں، اور خدا کے گھر حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت موسیٰ نے بھی بنائے اور
 آخر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ ہے، حضرت ابراہیم
 کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی،

”اور اس نے وہاں مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا، اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہاں اسحاق کے

نوکر دن نے کنواں کھودا“ (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوب کو جہاں مقدس روایا ہوئی، وہاں،

”اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اُس نے اپنا نیکہ کیا تھا، کھڑا کیا، اور اس کے سرے

پر تیل ڈالا، اور اُس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو بن نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب بن

سے جو توجہ دیگا، دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا“ (۲۸-۱۸-۲۲)

حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے،

”اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائو، کیونکہ اگر تو اس کے

لئے اوزار لگائے گا تو اُسے ناپاک کر گئے، اور تو میری قربان گاہ پر پیڑھی سے ہرگز مت چڑھو، تاکہ تیری

برائی اس پر ظاہر نہ ہو“ (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰ نے خدا کے حکم کے بموجب،

”اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لئے بارہ ستون بنائے۔“

..... اور سلامتی کے ذبیحہ بیچوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے اُدھا خون کے

با ستون میں رکھا، اور اُدھا قربان گاہ پر چڑھا“ (خروج ۲۴-۲۲-۶)

ادپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام دنا ہے، قربان گاہ (بتایا گیا ہے) اور دوسرا

بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربانگاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں، کعبہ مسجد حرام، اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے،

حضرت اسماعیل کی قربانی | اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب اور اس کے سشرائط حضرت ابراہیم نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور

توراة کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیل تھے، اور یہ بحث بھی وہیں گزر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراة کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ، جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا، اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کئے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر منڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربانگاہ پر بھائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلانی جاتی تھی،

ملت ابراہیمی کی حقیقت | توراة اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی قربانی ہے، اور یہی قربانی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور

اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراة کی کتاب پیدائش میں ہے، (۲۲-۱۶-۱۷-۱۸)

”خداوند فرماتا ہے، اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہان اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے

اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں

اور دریائے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤں گا، اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی،

اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائیگی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔“

قرآن پاک میں ہے،

وَإِذْ أُنْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَتٍ فَأَتَتْهُنَّ
قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا،
(بقمرہ - ۱۵)

وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي
الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ إِذْ قَالَ لَهُ
رَبُّهُ اسْلِمْ قَالَ اسْلَمْتُ لِربِّ الْعَالَمِينَ
(بقمرہ - ۱۶)

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَّاكَ
تَجَزَّىٰ مَحْسُنِينَ، (مفت - ۳)

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں،
اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ
کہا باریک علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم
دروہانی نسل پر برکت نازل کی،

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوئی
اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنے عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ
خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا
کئے بغیر دنیا کی پیشوائی اور آخرت کی نیکی نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکاؤنٹ سے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین
کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمنائوں اور آرزوؤں کی قربانی تھی، اور خدا کے

حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشید حقیقت کا ظل مجاز تھا،

اسلام شہرانی پر | اسلام کے لفظی معنی "اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا" ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو حقیقہ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا،

فَلَمَّا أَكْمَلُوا تَحْلِيَّتَهُ لَلْبَيْنِ،

جب ابراہیم اور اسماعیل اسلام لائے، دیا فرمانبرداری

کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا (اور ابراہیم نے اپنے

بیٹے اسماعیل) کو پیشانی کے بجل زمین پر ٹھایا،

(صفت - ۳)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن

جو خود بیوقوف ہے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول

کیا، اور وہ آخرت میں بھی نیکون میں سے ہوگا،

جب اس کے رہنے اس سے کہا کہ اسلام لا، دیا

فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے (اس نے کہا

میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی، دیا اپنے

کو اس کے سپرد کر دیا،)

(مبتدأ - ۱۶)

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انھوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا، اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے، اور یہی ابراہیمی ملت ہے، اور اسی بار بار امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیم بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ

مین موجود ہیں، اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہو جو اس امانت کو سہ کر تمام دنیا پر وقت عام کر دے
چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ دَرَجَاتِنَا
اُمَّةٌ مُسْلِمَةٌ لَكَ مَا وَاَدِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبَّ عَلَيْكَ نَايَا اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو
عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُورُ
الرَّحِيمُ

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرمانبردار)
بنا، اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی
فرمانبردار) جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (درجہ)
کے دستور) بنا، اور ہم کو معاف کر بے شک تو
معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے
پروردگار! اس میں اپنا ایک سول بھیج جو تیری
آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے، اور ان کو کتاب اور
حکمت سکھائے، اور ان کو پاک اور صاف کرے

تو غالب اور حکمت والا ہے،

(بقرہ ۱۲۹-۱۳۰)

یہ رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سیدہ محمدی کا نثرانہ علمی و علمی تھا، اور
یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے،

یہ قربانی کہاں ہوئی | حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ میں اس مقام کا نام موراہ
یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے، اور بلو لوان کے جھنڈا یا بلند
اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن مختار مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر
توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ سے مشائخ امین او کسفورڈ یونیورسٹی
کے مطبع میں چھاپا ہے، اس میں اس مقام کا نام ”موریا“ لکھا ہے، اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے
مقابلہ سے بابل سو سائٹی لندن کی طرف سے مشائخ امین لندن میں چھپا ہے، اس کا تلفظ ”موریا“ کیا ہے اور

درحقیقت یہ لفظ مردہ ہے جو کہ مین بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے
 "خدا ابراہیم را امتحان کرده بدو گفت اے ابراہیم! عرض کر دیکھتیک گفت کہ اکنون پس خود را
 کہ چنانہ تست و اورا دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزین موریا برو و اورا در آن جا بریکے
 از کوہ ہائیکہ بنو نشان می دہم برے قربانی سوختنی بگذران، اباد اداں (صبح) ابراہیم ہواستہ (انہ گدلا
 خود را بسیار است و دو نفر از نوکران خود را با پسرخویش اسحاق برداشتہ و ہیزم بر اے قربانی سوختنی
 شکستہ روانہ شد، و بوسے آن مکانیکہ خدا اورا فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چٹان خود را بلند
 کردہ آن مکان و از دور دید، آن گاہ ابراہیم بجا دمان گفت شما ایس جا ہانید، تامن با پسرد انجا رویم و
 عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد شما باز آئیم" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے، اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے
 اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے، اور
 ہماری جماعت میں سے، جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصبح فی من ہوا الذبیح" نام ایک
 عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے، اس لئے یہاں بحث بے محل ہے، بہر حال حضرت ابراہیم
 کو حضرت اسماعیل کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہانہ قیام
 تھے، چند روز کی مسافت پر تھے، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام
 پر قربانی گذرانی جائے وہ کوئی قربانگاہ، اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لئے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیم نے
 خدا کی عبادت کی، اور سجدہ کیا، اور وہ قربانگاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ
 کہا جاسکے کہ "میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں" یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتی
 اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے، اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم
 کی بھی یادگار حضرت اسحاق کی نسل دینی اسرائیل میں موجود تھی، اور نہ ہے، اور نہ بیت المقدس یا بیت المقدس کی

دلاؤ نگاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھانا اب ہے،

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی، اور گو اس میں امتدادِ زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گرامیوں کے سبب سے اس میں بعض مشترکات رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی، تاہم اہل شئی باقی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشیاء سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اسی کی قمین کھاتے تھے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہان مشرکوں کے بتوں کی صفین تھیں، حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ، اور حضرت مریم کی تصویرین بھی تھیں،

مگر اور کعبہ | کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت اللہم ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبود اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ

أَوَّلُ بَيْتٍ قُضِيَ لِلنَّاسِ، (ال عمران: ۱۰۱) سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا،

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیم سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گرامیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیم کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلتکدہ میں توحید کا چرلغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا، کہ اس گھر کی چھار دیواری بند کر کے، دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۱۲۵) کعبہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں بھی اَلْبَيْتِ الْحَتِیقِ، (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیم اور اسماعیل نے مل کر، اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چھار دیواری کھڑی کی، فرمایا اِذْ يَضَعُ اَبْرَاهِيْمُ الْفُؤَادَ مِنْ اَلْبَيْتِ، (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی، حضرت

لے اخبار کہ لازرقی، وفتح اباری ابن جریر ذکر ہم احنام کعبہ، و سیرۃ ابن ہشام،

ابراہیم واسمعیل نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیم نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گنم گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جبار دن اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرائین ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لئے قرآن پاک نے کہا،

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ
سَلِّمْتُ لَكَ بَيْنَ يَدَيَّ (ج-۴) بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا،
اور ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیم کو اسی گھر کی جگہ بتا دی، اور اس کو ان کی جانپاہ اور ٹھکانا بنا دیا، کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں، تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا، کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربانگاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم، اسمعیل کو قربانی کرنے کے لئے لائے تھے، اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا، کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آنا ہوں، ضروری ہے، کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیم کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهَّرْنَا بَيْتِي (اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو عجوبہ تورات میں حضرت سلیمان کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکن کا ملک تھا، کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا، اور کبھی اس کا نام "بیابان" تھا، اور آخری بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عبرہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں، اس لئے حضرت ابراہیم نے جس وقت یہ فرمایا تھا، رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ، (ابراہیم-۶) خداوند امین نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لا کر بسایا ہے۔

۱۰
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

تو حقیقت میں یہ بن کھیتی کی ترائی اور بے آب گیاہ میدان اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی اور اس لئے حضرت ابراہیم نے یہاں حضرت اسماعیل کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی،

وَأَسْرُرْ نِيْ اٰهْلَكَ مِنْ الشَّجَرَةِ، اور خداوند! یہاں کے رہنے والوں کو چھپاؤ

(نقرا ۱۵-۱۶) کی روزی پہنچا،

”کہ“ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بائبل یا کلدانی لفظ ہے جس کے اہلی معنی گھر کے ہیں اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ یہ آبادی اُس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے دوسرے گزرتے تھے، اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور نفوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی، اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل بیت کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے، کہہ کا ترجمہ نام حضرت داؤد کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے، یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں ”بکت“ کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بکتانک ہے، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری نفوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے،

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ

پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ

وہی ہے جو بکتانک میں ہے،

بَبَكَّةَ، (آل عمران - ۱۰)

کعبہ کے نفوی معنی ”جو کھونٹے“ کے ہیں، چونکہ یہ گھر چھوٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے، اس لئے

کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا،

لے تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۴۴، مصر،

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے،

سر پین

”ثمودیون اور سبا و ان کے درمیان ایک مشہور مسجد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت

ثمود کا مقام تمام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا لین میں ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے، اور وہاں کا مشہور مسجد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں خانہ کعبہ ہے، رومیون کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پر کوپس مورخ لکھتا ہے، کہ ۱۴۵۰ء میں رومی سپہ سالار بلنیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا، اس میں تمام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دیگا، اس پر سپہ سالار نے کہا،

”تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ غنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو بیٹے بابت

کے لئے خاص کرتے ہیں، اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ صاف جج کا بیان ہے،

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کیساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں جج اور اراکان جج کا ذکر بکثرت ملتا ہے، یہاں تک کہ عیسائی عرب شعراء بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم جج کا اچھا خاصہ حصہ تھا، اور اسی کے سبب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ

لے گین کی تاریخ عروج و زوال ردوم باب ۵۰

مکمل نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا فلکی مطبع امیرہ بولاق مصر صفحہ ۳ بحوالہ (فرنجی) ایشیا نیک جنرل پریس لندن
مکمل مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقامت امت لکھنؤ میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیئے ہیں،

مکمل کتاب الاکنہ والا زمناہام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰،

ہن و بھرتن تک میں پہنچے تین کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس برقی
رسم کو ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے،

حج ابراہیمی یادگار | حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اس پر لبیک کہا تھا، اور
جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے، اور عین اس وقت جب چھری نے کر بیٹے کو خدا
کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر دن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی،

اَنْ يَّابُرْ هَيْمَةً قَدْ صَدَّقْتَ الرَّؤْيَا

یہ کہ اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم

اِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ

ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔۔۔۔۔

وَقَدْ بَيَّنَّاهُ بِذِي عَظِيمٍ (صَفَّت - ۳)

اور ایک بڑی قربانی دیکھنے اس کے بیٹے کو چھڑا دیا،

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کیلئے

مخصوص کر دینا، اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے،

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور

وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ

امن بنایا، اور دکھا کہ، ابراہیم کے گھر سے ہونے کی

مُصَلًّى، وَهَدَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ

جگہ کو نماز کی جگہ بناوا، اور ابراہیم و اسماعیل سے ہم

أَن طَهَّرَ إِبْرَاهِيمَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ

یہ کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور

وَالرُّجْعِ السُّجُودِ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ

رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کرادو

اجْعَلْ هَذَا بَيْتًا آمِنًا وَارْزُقْنَا أَهْلَهُ

یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اسکو

مِن الثَّمَرَاتِ مِن أَمْنٍ مِّنْهُنَّ بِاللَّهِ وَلْيُؤْمِرْ

امن والا شہر بنا، اور اس کے بننے والوں کو کچھ

الْآخِرَةِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمْتِعْهُ قَلِيلًا

پھلون کی روزی دے، جو ان میں سے خدا اور

ثُمَّ اضْطَرْبِ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَمِنَ الْمُنْذَرِ

پھٹنے والے دن پر ایمان لائے، خدا اسے کہا اور جس نے

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
 وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ
 السَّمِيعُ الْعَلِيمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
 لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً
 مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
 عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ
 رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو
 عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
 وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ
 وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا
 مَن سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ
 فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ
 إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ اسْلَمْتُ
 لِزَيْبِ الْعَالَمِينَ

(بقرہ ۱۲۵-۱۲۶)

انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچا دینا، پھر اسکو دوزخ
 کے عذاب کے حوالہ کر دینا، اور وہ کتنی بری باز
 ہے، اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر
 کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، (اور یہ دعا مانگ رہے
 تھے کہ) ہمارے رب (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے
 قبول فرما، بیشک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے
 اسے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلّم)
 فرما بنا، اور ہم کو اپنے حج کے ارکان دکھا، اور ہم پر
 اپنی رحمت رجوع کر، (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ
 قبول کرنے والا اور رحم والا ہے، اسے ہمارے ربنا
 ان میں، انھیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج
 جو ان کو تیری آیتیں سنائے، اور ان کو کتاب اور
 حکمت کی تعلیم دے، اور ان کو پاک صاف بنائے
 بیشک تو غالب اور دانا ہے، اور ابراہیم کے دین سے
 کون منہ پھیرے گا، بجز اس کے جو اپنے آپکو نادان بنا
 حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا، اور
 آخرت میں وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا، یاد کرو
 جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلّم)
 بن جا، اُس نے کہا عالم کے پروردگار کا میں تابعدار

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
 أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ
 لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ
 وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا
 وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ
 لِيُشْهِدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ
 اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَةٍ عَلَىٰ مَأْرَقٍ مِّنْ
 مِّنَ الْبَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا
 وَأَطِيعُوا أَمْرَ الْفَقِيرِ ثُمَّ لَمَّا قَضَوُا
 تَحَفُّظَهُمْ وَوَلَّوْهُمُ آيَاتِهِم وَلَقَّوْهُمُ
 بِأَلْبَيْتِ الْحَتِّ ذَٰلِكَ وَمَنْ يُعِظَمْ
 حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ
 (حج - ۲۷)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ
 کو دکھانا بنایا، کہ کسی کو میرا سا بھی نہ بنانا، اور میرے
 گھر کو طوافِ قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں
 کے لئے پاک کر، اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے
 وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ہوئی)
 عربی سواروں پر، ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے
 تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں، اور ہم نے
 ان کو جو چاہے جانور روزی دے، ان پر
 ان کی قربانی، پرچہ جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام
 لیں، تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بد حال فقیر
 کو کھاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچل دو کرین، اور
 اپنی متین پوری کرین، اور اس قدیم گھر کا چکر لگا
 یہ سن چکے، اور جو کوئی، اللہ کے آداب کی بڑائی کے
 تودہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے،

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا
 الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ
 الْأَصْنَامَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كُنْتُ
 مِنَ النَّاسِ يَفْعَلُ بَعْضُ النَّاسِ فَيَنْتَفِعَ
 بِغَدَابَتِي فَاذْكُرُونِي أَنِّي مَشْكُورٌ

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی، اسے میرے
 پروردگار اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھ کو اور میری
 اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار
 ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری
 پیروی کریگا، وہ مجھ سے ہوگا، اور جو میری نافرمانی

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادِعَ غَيْرِ
ذِي نَرْسِيعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا
لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ
تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ
لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ، رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ
مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ، وَمَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ
مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ،
(ابراہیم - ۴)

زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے،
کہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی
کو وشرک سے منع فرما کر، اور ابراہیم مشرکوں میں
نہ تھا، بیشک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا
وہی ہے جو کہ میں ہے، بابرکت، اور دنیا کیلئے
راہ نما، اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم
کے گھرے ہونے کی جگہ، اور جو اس میں داخل ہوا
وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا
قصد کرنا فرض ہے، جبکہ اس کے راستہ (سفر) کی طاقت
ہو، اور جو اس قدرت کے باوجود اس سے باز
رہے تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے،
(ال عمران - ۱۰)

یہ وہ آئینہ بین، جسکا تعلق اس موضوع سے ہے، ان میں نہایت وضاحت کیساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگردان اور آوارہ پھر رہے تھے، اور ایک امن کے سنان مقام کی تلاش میں تھے، تاکہ وہ خدا کے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائیں، یہ جگہ غنیمت کیا، جوازل سے اس کام کے لئے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چار دیواری کو کھڑی کریں، اور پھر اسکو توحید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں،

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیم نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا، اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں اور ان کو اس لئے یہاں بساتا ہوں تاکہ وہ اس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے رہیں اور تیری خالص عبادت بجالائیں، ان میں جو نیکو کار ہوں وہ میرے ہیں اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہی، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا، جو ان کو نیک تسلیم دے،

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیم کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں، اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے، اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں، اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں، اور یہاں اسماعیل کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں، اپنی تذر پوری کریں، اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے عظیم پیکر ہوں، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکے ہوں، نہ ایک چوٹی تک کو مار سکتے ہوں، اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں، اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے، ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں، اور تورات کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا دستور تھا، کہ وہ جہاں

کہیں کوئی قربانی کرشمہ دیکھتے تھے، تہذیب کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھرے پتھر کو گھرا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے، وہاں قربانی گذراتے، اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قوم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی تورات کے حوالوں سے گذر چکا ہے، کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لئے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا، نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا، پھر جان یہ مذکور ہے کہ "اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے، مگر مین تہ بند باندھتے تھے، تورات کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیم نے جواب میں "لیک" کہا اور اردو میں ہے کہ "میں حاضر ہوں" کہا، یہی صد اکتیکہ اللہ صلیکہ اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گذر چکا ہے کہ جس کو نذریا قربانی کرتے تھے، اس کو قربانگاہ کے چاروں طرف پھرتے تھے، یا اشار کرتے تھے، حج میں یہ طواف کہلاتا ہے، غرض انھیں سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں "حج" ہے، حج کی حقیقت ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا، اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اور عہدیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے، اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے، جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تہذیب کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلا اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت

اسمیں کی طرح خدا کے حضور میں تضرع کرنے جاتے ہیں، اس لئے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں، نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر جھپاتے ہیں، اور اسی واسطہ انداز سے جس طرح ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے، دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں، اور جس طرح حضرت ابراہیم نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے،

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ
 مَیْنِ مَاضِیْہِیْنَ اے اللہ، مَیْنِ حَاضِرِہِیْنَ
 لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ
 حَاضِرِہِیْنَ تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں
 وَالْمَلٰئِكَةُ
 اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں، اور سلطنت تیری

(صحیح مسلم ج ۱) ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں،

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں، جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربانگاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں، اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھر کر تصدیق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروی تک) حضرت ابراہیمؑ دوزخ گئے تھے، کہ مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کرینگے، وہاں ہم دوڑتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر، اپنی تمام گزشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گر گڑا تے ہیں، روتے ہیں، تصور معاف کراتے ہیں، اور آئندہ زندگی کے لئے، خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں، اور یہی حقیقت حج کا اصلی رکن ہے، یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے نقش قدم اور

لے تو منہی کتاب الطحاوی، باب ما جاء من ادراك الامامہ جمع فقہاء اور کمالیج،

ان کی دعا کے مقامات، اور تجلیات ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد، اکثر دن کو عزمین ایک دفعہ اس مقام پر آسکے کا موقع، اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل و صورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر، دعا و مغفرت کی پکار، گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار، اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گذر، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے، اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تیش میں جہانی طور سے ذبح کرتے ہیں، اور اس وقت اسی اطاعت اسی ذہنیت اسی سرفروشی، اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت، اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور یہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِۙ

وَالْاَرْضِ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

بکرا اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں (الغافر - ۹)

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَنَحْوَیْ وَمِمَّا قِیْ

لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، لَا شَرِکَ لَہٗ

وَسَبْدَ الْاَلْفِ اُذِیْتُ، وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنے سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی حکم ہے جو پہلے اور

(انعام - ۲۰)

میں سب سے پہلے فرمانبرداری و اسلام کا اقرار کرتا ہوں

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم انسان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں،

حج کی اصلاحات | حج کی فرضیت دوسرے عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات ارکان اور خصوصیات سے عملاً نااہل تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی اور بتدريج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی، اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزہ نے بھی یوم عاشورہ سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدئے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے ہر ایک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا،

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنالیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکے تھے، تو تمام قبائل منیٰ میں آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا، اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الہی کی جگہ اپنے اپنے آباء و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اَوْ
اَشْدَّ ذِكْرًا،

ہیں طرح اپنے باپ دادا کو ذکر کرتے ہو،
وہی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے

(بقرہ - ۲۵)

ساتھ خدا کی یاد کرو،

۲۔ قربانی کرتے تھے، تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے، کہ خدا سے تقرب

حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹنا قربانگاہ پر دیتے تھے، اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مسادی گئیں، اور یہ آیت اتری،

لَقَدْ يَنْبَأُ اللَّهُ كَوْمَؤُهَا وَلَا كِمَاءُهَا وَلَكِنْ

يَتَنَالُهُ الْتَقْوَىٰ مِنكُمْ (ج-۵)

پہنچتا اس کے پاس صرف تقوا تھا، تقویٰ پہنچتا ہے،

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی مینافت کی جائے، اور اس چیز پر بھی

کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے،

۳۔ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے، تو زادراہ لے کر نہیں چلتے تھے، اور

کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب کہ میں پہنچتے تھے، تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَتَزِدُّوْا فَاِنَّ خَيْرَ الْاَزَادِ التَّقْوٰی،

زادراہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادراہ

پرہیزگاری ہے،

(بقرہ - ۲۵)

۴۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لئے تھے، ان کی بنا

پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ

رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتارنا کر رکھ دیتے تھے، ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی

کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حبثہ کبر اقیم کیا جاتا تھا، اور مرد و مردوں کو اور عورتیں عورتوں

کو خاص طواف کے لئے کپڑا مستعار دیتی تھیں، اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس

فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف

کر دیا، اور یہ آیت اتری،

لے بخاری جلد ۲۱ کتاب الحج لے طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بخاری جلد ۲۲ ص ۲۲۶ اکت باج،

خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳۱) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

اور سہ ماہی کے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی،

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدودِ حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت تری

ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ ۱۵۸) کو چروہین سے کروہان سے تمام لوگ کرتے ہیں

۶۔ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے، اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پائی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی،

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک نئے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہرقماش کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگ فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھڑغانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے کلیتہً ان باتوں کو بند کر دیا، اور حج کو تقدس، توزع، نیکی، اور ذکر الہی کا ستر پامرتع بنا دیا، حکم آیا،

فَمَنْ قَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ (بقرہ ۲۵۸)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے چھڑچھاڑ، ہونہ فحاشی ہے، نہ لڑائی نہ لڑائی

ہر اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہوگی

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ آیام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گناہگار نہ تھا، اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا،

لَمَنْ تَجَلَّ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى

جو شخص غلبت کر کے آیام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بہتر

اس نے تقویٰ اختیار کیا،

(بقرہ ۲۵۰ - ۲۵۱)

۹۔ ایک خاموش حج ایجا کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اُس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انھوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے،

۱۰۔ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا جانے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ اپنے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا، اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں، آپ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا، دو پہیہ اوڑھنا چاہئے، اسی سبب قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اُس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار

لے جانے کا حکم دیا، اسی سبب قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اُس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار

ہونے کی تاکید کی۔

۱۱۔ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے، بلکہ پھوپھاڑے سے کود کر آتے تھے، اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے

سے گھر میں گھس آیا، تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت و ملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا

مگر کے پھوپھاڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آتَى الْبُيُوتَ

صراط اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا، اور گردن

مِنْ أَلْوَابِهَا (بقرہ - ۲۴) مین دروازے کی راہ سے آؤ،

۱۲۔ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقین

سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک میں نیل ڈال لیتے تھے، اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے، تو اس کی نیل کو اسی طرح آپ نے ایک شخص کو

دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے، اور وہ اس کو طواف کر رہا ہے، آپ نے رسی

کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کر آؤ، ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے

ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذرمانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے، آپ نے

فرمایا کہ اس شکلیے کو دور کر دیے نذر نہیں ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو،

۱۳۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سوار یا ن ج سے واپس آجائیں، اور انکی

پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں، اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص ایام حج میں عمرہ کیا،

اور علا اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا،

۱۴۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۲۵ کتاب الحج باب ۱۲ ص ۲۶۷ باب الکلام فی الطواف مگر بخاری مکتبہ جامعہ باب الکلام

فی الطواف مکتبہ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۶۷ مکتبہ بخاری باب ایام الجاہلیہ

۱۴۔ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ توحج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے، اس کو طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لیے آتے تھے وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالحجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے، اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے، اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے، اور غیر حاجیوں کا جو جمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا، اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس و حرمت کے خلاف نہیں، اس لئے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں، فرمایا:

لَکِنَّ عَلَیْکُمْ جُمَاعٌ اَنْ تَتَّبِعُوْا اَفْضَلًا تمہارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں)
مِنْ تَبَعِکُمْ، (نہیہ - ۲۵) فضل الہی (تجارت) کی تلاش کرو،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔
۱۵۔ صفاء و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے، انصار مناتہ کا احرام باندھتے تھے جو مثل من قادم کیا گیا تھا، اور طواف نہیں کرتے تھے، ان کے علاوہ تمام عرب صفاء و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے قاف کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفاء و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ھلم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

لے اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب حج میں تجارت کرنا بل جانتے تھے اس لئے یہ آیت اتری، دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خاص خدا کے لئے ہو گیا، اس لئے اب اس میں تجارت مناسب نہیں، یہ آیت اس خیال کی تردید کے لئے اتری، لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے، اور روایتوں کے جمع کرنے سے اسکی تصدیق ہوتی ہے، (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول و احمدی میں آیت مذکورہ)

سے صحیح بخاری
کتاب الحج و عمرہ
اول صفحہ ۲۱۳

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ
 صَعِدَ مَرْوَةَ خَذَاكَ شَارِبِينَ أَوْ شَرِبَ مِنْهَا
 حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ
 کرے اس کے لئے ان دونوں کا پیرا لگانا
 أَنْ يَطُوفَ بِهِمَا، (بقرہ - ۱۹) نہیں ہے،

حج کے ارکان | اب اس اصلاح، تزئیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں،

احرام - تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا، نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے، اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیاوی عیش و نشاط، زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کیلئے کسی جاندار کی جان ایسا، بہر حال خود غرضی ہے، ابی بی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے، اسلئے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا، اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلعے ہوئے کپڑوں کو اتار دین اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لئے باہر رہے، یہ عہدِ ابراہیمی کے لباس کی تشیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شاہِ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ، بے تکلف، اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے،

طواف - یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کعبہ میں آکر اس رکن کو ادا کرنا ہے جو

حضرت ابراہیم کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربانگاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت میں وہ انبی منفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے، جبکہ ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ سَبَّأْنَا اِنْسَانِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقَدْ عَظَمَ النَّاسُ هَذَا وَنَدَامُ كُودُنِيَا مَن نَّيْلِي دَعَا وَرَاحَتِي مَن نَّيْلِي دَعَا اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو، اور حکم ہوا کہ

وَلْيَطُوفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ، (حج - ۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کریں،

حجر اسود کا استلام، "حجر اسود" کے لفظی معنی "کالے پتھر" کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانہ کعبہ میں سیون دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیم کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے، (الآیہ کہ اس میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لئے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑیگا، اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضرب ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان

لے ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم،

کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں، یہ نہ ہونے کی طرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگار ہی پتھر ہے، مگر ایک شتاقِ زیارت کی نگاہ میں اس نخل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں، اور پھر تمام خلفائے راشدین، صحابہ کرام، ائمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکماء و عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنگا رب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دونوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب ہر سید کر دیا ہے، اور بایں ہمہ ہم مسلمان ہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے، جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار مشواٹے نے اس کو چوم کر کہا، "اے کائے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا، الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اُس محبت کا نتیجہ ہے، جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیم و اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے، اور نہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے، نہ اشارہ کرے تو اس کے اس کے ادا سے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا،

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا } صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑ یا تھیں، جو گو اب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سوارہی کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب

سُلا یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، سُلَہ صحیح مسلم در ترمذی و مستدرک و غیرہ باب الاستلام،

کی آواز سے رُک گئے، اور اسماعیلؑ کی جگہ پر سینہ ڈھاکر بانی کیا، بعض روایتوں میں ہے، کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر حبیب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بیتاب ہو گئے تھے، تو حضرت ہاجرہؑ صفاء و مردہ کے دریا پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفاء و مردہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہر حال حج میں پہلے صفاء پر پھر مردہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں، پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مردہ پر آتے ہیں، وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں، کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کو نظر آئے،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْكَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ
حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ
اَنْ يَّطُوفَ بِمَا بَيْنَهُمَا (بقوہ - ۱۹) گناہ نہیں،

وقوف عرفہ - عرفات میں نوین ذبیحہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا، اور نواں کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے، اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کو سون تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رد و کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں، یہیں جبلِ رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے، اور اُن کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دونوں میں مغفرت اور رحمت الہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو دہنے بائیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے، کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے،

قیام مزدلفہ۔ حج کا زمانہ بھیر بھار، اور دوز و صوب کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منی کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خشکی سے چور ہو جاتے، اس لئے انھوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشر حرام کہتے ہیں، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا اسلئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا،

فَاِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ
عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوا كَمَا هَدَا
وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الضَّالِّينَ

توجہ عرفات سے چلو تو مشر حرام کے پاس خدا
کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے
تم کو بتایا، اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے

ہوئے تھے،

(بقہ ۴-۲۵)

منی کا قیام۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں" رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکہ کی وسعت ماحل کی اور قربانی کی کوئی حد نہ رہی، اور مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لئے منتخب کیا جبکہ نام منی ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے،

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فحاری کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس یہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے

لے موطا امام مالک، باب ما جاء في الخرفاء،

خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف و محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا،

وَإِذْ كُنَّا لِلَّهِ قَرِينًا ۖ قَدْ آتَيْنَا مَعْدُودَاتٍ (۲۵) خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی۔ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ مئی کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے، تہمین لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو، اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے

عَلَىٰ مَا رَزَقْنَاهُمْ مِنْ بَيْمَتِهِ الْأَنْعَامِ جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ (۲۶) کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے بارے میں فقیر کو کھلاؤ،

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں، کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے،

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو

مِنَ الصَّدَقَاتِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامٌ ثَلَاثَةَ جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی میر

آيَا فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتَ، نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات

(بقرہ ۲۷۴ - ۲۷۷) دن واپس ہو کر

حلقِ راس۔ مئی میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم

کی تعمیل ہے، کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈا دیتے، ساتھ ہی اس رسم

میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا، کہ جو غلام بنا کر آدو کیا جاتا تھا

اُس کے سر کے بال منڈا دیئے جاتے تھے، یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی

لے تو اہل فاضل ۱۳-۵ گنتی ۶-۵ ابن سعد جز ثانی قسم اول ۳-۵ دیرہ ابن ہشام ذکر بیرونہ، واقعہ عمر ابن امیہ و جتر ناصیہ لفظ

کا اقرار و اعتراف ہے، اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

مُخَلِّقِينَ سُرْعًا وَسَكْرًا وَمُقَصِّرِينَ (فتح-۴) اپنے مردن کو منڈا کر یا بال ترشوا کر
وَلَا تَخْلِقُوا أَسْرًا وَسَكْرًا حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْمُ اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ
مَحَلَّةٌ (بقراءۃ-۲۲) پر نہ پہنچ جائے،

رہی چار۔ منی ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا،
انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا، جس کے نقلی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں، اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے
انہار کا طریقہ تھا، اور اسی لئے شیطان کو ”رجیم“ یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں، صاحب نظام القرآن کا نظریہ
ہے کہ ابراہیم کے شکر نے کہہ پر جب چڑھائی کی تھی، تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں
نے اس ناگمانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا، جس کا ذکر سورہ فیل کی آیت تَرْمِيهِمْ بِحِجَابِ
مِثْرٍ مَّيْمَنٍ مِّنْ هَٰؤُلَاءِ، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس شکر کو تباہ کیا، اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریوں
کا پھینکنا اسی تَرْمِيهِمْ کی سنگ باری کی یادگار ہے، خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں
پر پھینکتے ہیں، اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری ماننا یا پھینکنا بظاہر
ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری
پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، قرآن پاک نے بھی اسی
حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے،

فَإِذَا قُضِيَتْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ جب سب ارکان ادا کر چکے تو اپنے باپ دادا کو
لَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ إِشَادًا ذِكْرًا (بقراءۃ-۲۵) جیسے یاد کرتے تھے، ویسے ہی خدا کو یاد کرو، بلکہ اس سے بڑھ کر

سہ مشکوٰۃ باب رمی جمار بجالہ داری، و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح،

اسی رمی جوار پر مراجم حج کا خاتمہ ہوتا ہے،

ان رسوم کی غایت | ادھر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پُرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے، تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے، اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تائید کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں، اور خدا کی یاد، اپنے گناہوں کی منفرت، اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہدِ نیا حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جو پیدا کر کے، تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا، کہ کنکری مارنے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے،

وَيَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ (حج - ۱۰) اور تاکہ اُن مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو، حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربّانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں، جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں، اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام مَشْعَرَاتُ اللّٰهِ اور حُرُمَتِ اللّٰهِ ہے، یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں، اور انہیں مشاعرۃ اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۃ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ (حج - ۱۰) اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے

عِنْدَ رَبِّهِ، (حج - ۱۰) تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے،

صفا و مروہ کی نسبت ہے،

لے ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج،

إِنَّ الصَّمَا وَالْمَكْرُوكَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ (بقرہ-۱۹) اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں،

اور سورہ حج میں فرمایا،

ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا

مِنْ تَقْوَىٰ الْفُلُوبِ، (حج-۱۲) دلوں کی پرہیزگاری ہے،

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں، اُن کی یاد قائم رہے، اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرنا ہے، حج کے آداب | حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے یہاں تک کہ کسی چوٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لئے جائز نہیں، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و اشتی اور امن و امان ہوتا ہے،

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِمْ الْحُجَّ فَلَا سَفَاطَ وَلَا

فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحُجَّةِ وَمَا تَفْعَلُوا

مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ، (بقرہ-۲۵۰) نہ گناہ کرنا، اور نہ جھگڑا کرنا ہے، اور جو بھی نیکی

کام کروا اللہ اس کو جانتا ہے،

غَيْرُ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُّوا، (مائدہ-۱) حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں،

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں، اُن کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا، کہ یہ اس خانہ الہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بد معاشرین کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رُکے، وَلَا آمِنِينَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ يَلْعَنُونَ فُضِّلًا اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو

مَنْ رَیْبِهِمْ وَرَضُوا نَا (ماثد ۴-۱) حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی قربانی اور خوشنودی کو تلاش

کرنے نکلے ہیں،

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصد اصادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جبکہ نام کفارہ ہے یعنی اُس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجون کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَ مِنْكُمْ مَتَعِدًا مِّمَّا فَخَرَكُم مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعِيمِ فَكَفِّرْ بِهِ ذَوْا عَدَلٍ مِّنْكُمْ هُدًى يَبْلُغُ الْكَعْبَةَ أَوْ كَمَا رَكَّ طَعَامُ مُسْلِكِينَ أَوْ عَدَلٌ ذَكَرَ صَبَا مَالِيَدُ وَقَ وَبَالَ أَمْرِهِ

اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مست مارو، اور تم میں جو جاگیر مار گیا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے موشی میں سے، اسکا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں، کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کیجائے، یا اس کے گناہ کا اتار ہے، کچھ محتاجون کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے،

تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکے، (ماثد ۴-۱۳)

اس سے ثابت ہوا کہ حج تا ترصلع و سلامتی، اور اس و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی

حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے،

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں | محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکلیفی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے، اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتر سے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں، بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں،

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیلؑ کی نذر اور گمہ بن ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعائیں وہ تائید و مقاصد کو جامع ہے، آئیے ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنَا
وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى
وَعِذًّا لَّنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ
طَهَّرَ ابْنَتَيْنِ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَ
الرُّكَّعِ السُّجُودِ، وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ
أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ،

اور جب ہم نے اس گھر کعبہ، کو لوگوں کا مرج
درکز اور امن بنایا، اور ابراہیم کے کھڑے ہونے
کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور
اسماعیل کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو
طواف کرنے والوں اور کھڑے ہونے والوں
اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں
کے لئے پاک و معاف کرو، اور جب ابراہیم نے
کہا، میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا،
اور اس کے رہنے والوں کو پھلون میں سے روز

(بقرہ ۱۲۵ - ۱۲۶)

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن
ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ
وَارِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ
أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ
فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ،

اسے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا تاجدار
گروہ بنا، اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرزند
گروہ بنا، اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا، اور
ہم کو معاف کر، تو بے شک معاف کرنے والا
اور رحم کرنے والا ہے، اور ان میں انہیں میں
سے ایک رسول بھیجنا،

(بقرہ ۱۲۵ - ۱۲۶)

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
إِنَّ لَّاشْرَكَ فِي شَيْئٍ وَطَهَّرَ ابْنَتَيْنِ

اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ ٹھکانا دی
کہ میرا شریک نہ بناؤ، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں

لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ،
وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا
أَوْ عَلَى كُلِّ مَضَامِيرٍ ثَلَاثِينَ مِائَةً
لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا
اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَمَا
رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ

کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور
سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک و صاف کر، اور
لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیسے پاس
پیداہ اور سفر کی ماری و بلی تہی ہو جانے والی
اونٹنیوں پر سوار ہو کر، دور دراز راستہ سے
آئیں گے، تاکہ فائدے کی جگہوں میں اگر جمع ہوں
اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد
کرین کہ ہم نے ان کو جانور روزی کئے،

(حج - ۲)

وَأَذِّنْ قَالَ ابْنُ هِشْمٍ سَرِبَ أَجَعَلَ هَذَا
الْبَلَدَ أَمْنًا وَاجْتَنِبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ تَعْبُدَ
الْأَصْنَامَ، سَرِبَ أَتَهْتَ أَضَلَّتْ كَثِيرًا
مِنَ النَّاسِ بِمَنْ تَبَعَنِي فَاتَّهَمَنِي وَ
مَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ، رَبَّنَا
إِنِّي اسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ
ذِي نَرْجِعَ عَنْكَ بَيْتِكَ الْحَرَامِ، رَبَّنَا
لِيَقْبَلُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ
النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنْ
الْأَمْثَرِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ،

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو
امن و آبی بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے
بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار
ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، تو مجھے
میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی
کی تو تو بخشنے والا رحیم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار
میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں
تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے، ہمارے
پروردگار اے تاکہ وہ ناز کھڑی رکھیں، تو لوگوں کے
کچھ دنوں کو ایسا بنا کہ وہ انکی طرف جھکیں، اور انکو
پھلون کی روزی دے تاکہ شکر گزار ہوں،

(ابراہیم - ۶)

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے،

- ۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع، اور ملتِ ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے،
- ۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدا سے واحد کی عبادت کرتی رہے، اور بت پرست قوموں کے میں جہل اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر ہر بے نشان نہ ہو جائے، اور آخر ان میں وہ رسولی مبعوث ہو جس کی صفیتیں ایسی ہوں
- ۳۔ یہ لوگ ایک دیرانہ میں جہن کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں، تو تو اس بے ثمر اور شور زمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا، اور لوگوں کے دونوں کو ان کی طرف جھکانا، کہ وہ ان سے محبت کریں،
- ۴۔ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ بیتِ مکہ میں گئے تاکہ یہاں آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں، اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں،
- ۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں، خداوند! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے،
- ۶۔ خداوند! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لئے تمام لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے پابند ہوں، آلِ ابراہیمؑ ہیں، اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں،
- الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں،
- مرکزیت**۔ خانہ کعبہ اس دنیا میں عرشِ الہی کا سایہ اور اس کی رستمن اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفیتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شجاعوں سے منور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا، اور اُس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و

معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کمرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جہین
 ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے
 ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری
 اختلافات، اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے
 ہیں، اور ایک ہی مقام کو اُمّ القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ روپ اور
 دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت
 (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام
 قومیں اور مختلف ملکوں کے بنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی لعلتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک
 آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی
 ہیں، اور تھوڑے دن کے لئے عرصہٴ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباسِ احرام میں، ایک وضع
 میں، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا
 سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانوں
 میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، اس لئے یہ حرم ربّانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا
 گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم نادر ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا
 کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بد امنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے،
 لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے
 وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں
 ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا، اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے
 ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیم

کے لئے مدت دراز سے اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے، اور اسلام کے علم امتدّٰن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے، آج دنیا کی قومیں "ہیگ" (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالتگاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں، لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوانہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالتگاہ ہمیشہ سے قائم ہے، جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکام الہی ہیں، جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، یہ جج کا موسم اُن کی سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے، اسپین سے لیکر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے، اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے، اور طریق عمل طے کرتے تھے، اور مختلف ملکوں کی رعایا اگر، اگر اپنے دایوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں، تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی، اور انصاف پاتی تھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل جج کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی، اور فرمایا

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ
وَهُوَ الَّذِي الْخَصَامُ، وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى
فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ
وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ،

بعض آدمی ایسے ہیں کہ اُن کی بات دنیا کی زندگی
میں بھلی معلوم ہوتی ہے، اور جو اس کے دل میں
اُس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ پُرے دھڑ
کے جھگڑاؤ میں اور جب پیچھے پھیریں تو ملک میں
دوڑتے پھرتے ہیں، اگر اُن میں بے امنی برپا ہو، اور تاکہ
کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد پیدا کرنے کو

پھر وہ آیتوں کے بعد فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلَاحِ
كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (بقرہ-۲۵)

کہلا دشمن ہے،

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز قلیون، ملکون، اور شہرون میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا، اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہی، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو سیکھنے خطاب کیا اور سب نے سمجھا و طاعت کیا، آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے خلفائے زمانہ بھی بڑے کرام اور ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ سنت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں،

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور فتاویٰ کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر اگر یہاں سمٹ جاتے تھے، اور تمام دنیا کے گوشوں سے اگر حرم ابراہیمؑ میں جمع ہو جاتے تھے، اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراکندہ تھا، ابراہیمی درگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے، یہیں اگر تجارت کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے شامی، عراقی اور مصری، حجازی سے، بصری کوئی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلیسی، سندھی، (ہندوستان) سے، رومی یعنی سے فیض پاتا تھا، اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں، اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں، اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام

میں پہنچ جاتا تھا، ابن مسعود کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے، اور ابن عباسؓ کے مشرشد ابو ہریرہؓ کے مستفیدوں سے، اور انسؓ کے حلقہ کے فیضیاب علیؓ کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا، جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے، اور یہی تہذیب و تہذیب وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و مناسبات اور احکام و فرائض و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا، اور آپ کے سیر و مناسبات اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں، اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے، اور ائمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجماعی مسائل کو الگ کر سکیں، اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدون ہوں اور پچھلے ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکیں اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے،

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں، وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قوم کی مصیبتوں کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی، اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں، جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے، یہیں اگر چینی مراکشی سے، تونسہ ہندی سے، تاتاری جشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی انگریزی سے، افریقی یورپین سے، ہاوی بلغاری سے ملتا ہے، اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں،

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، انشا

کے رنگ کو پہچاننے، اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے، اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیا بے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لئے بے چین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی لگے گی، جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا، اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے، مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہیں، جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا، اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی، یا قوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں، مسلمانوں میں جغرافیائی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے،

رزقِ ثمرات۔ اس مرکز کو قائم، اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بننے والوں کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لئے حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی، کہ "خداوند! میں نے اپنی اولاد کو اس بے چارے اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے، تو لوگوں کے دل اُن کی طرف جھکنا، اور اُن کے رزق کا سامان کرنا، اور اُن کو پھل کی روزی دینا" اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی، کہ یہاں کے بننے والوں کے لئے زکوٰۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کیجاتی، لیکن یہ اُن لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتے، جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا، اور اس کو اُن کی روزی کا سامان بنا دیا، حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کا جہان کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے تھے اور حضرت اسحاقؑ

کے بیٹے تھے، بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب کے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے، (مکرمین ۳۷-۲۸ سے ۲۶ تک) تورات کے متعدد مقامات میں عرب سودا گردن اور تاجرون کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سودا گر تھے، جس کا ذکر سورہ "کاسیلاف" قریش "میں ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر و روم تک جاتے تھے،

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی کہ معاملہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے خود تک کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا، اور عسکاف وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق، اور اس شور و بے چل زمین کے بنے دانوں کے لئے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینے یمن یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کمالتے ہیں، کہ وہ سال بھر کھاپی سکین، کتہ سے دیتہ کو جب قافلہ جاتا ہے، تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدو اپنے چل اور پیداوار لے کر آتے ہیں، اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسرے ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں، اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں، اور آخر یہی زور معاوضہ اہل کتہ کے قوت لایوت کا ذریعہ بن جاتا ہے،

قربانی کی اقتصادی حیثیت | اس ملک کی فطری پیداوار دن میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانور دن کی پیداوار ہے اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیاہ کے لئے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جنہیں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی، اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپیہ اور بکری کی چار روپیہ وہاں ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپیہ ہر سال اہل بادیاہ کو اپنے لئے تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھو میری تالیف ارض التکران جلد دوم باب تجارت العرب قبل الاسلام،

جانوروں کی فروخت سے ملے ہیں، اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی سزا
 ابراہیمی دعا کی مقبولیت | حضرت ابراہیم نے اپنی دعا زمین خاص طور سے پھلون کا ذکر کیا تھا،

وَأَرْزُقْنِي أَهْلَكَ مِنَ الثَّمَرَاتِ، اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلون میں سے

(بقرہ - ۱۵) روزی دینا،

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل میسر ہے
 سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں، اور دعاے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان
 کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے،

تجارت، | قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا
 ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے

وَلَا آمَنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ

اور نہ ان کو دستاؤ جو اس ادب والے

فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا، گھر کے قصد سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل

(مائیدہ - ۱) خوشنودی تلاش کرتے ہوئے،

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں، کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے
 تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے اسلام کے بعد بعض صحابہ
 نے اپنے اس خاص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا، اس پر آیت
 نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں، کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت
 کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے، فرمایا۔

وَتَزِدْ دُورَاتِ خَيْرِ النَّاسِ إِدِ التَّقْوَىٰ اور راہ کا توشہ (خرچ) لیکر چلو، کہ راستہ کا

وَأَتَّقُوا يَا أُولِي الْأَلْبَابِ، لَئِنْ عَلِمْتُمْ سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے،

جُنَاحٌ اَنْ يَّبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ تَرْتِبِكَ ۝

تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل

(بقرہ ۵-۲۵)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں، درست نہ تھا، کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے، کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی، ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے، یہ مقام گویا مسلمانوں کی عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز، اور مالکِ اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کوئٹہ اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کچھ تو بھلا دیا ہے، اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں، اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے، اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں،

روحانیت - روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں، اُن کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی، اور تیسری خاص روحانی ہے، وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے، اور ہر لباس پہنتے ہیں تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جہانی طور سے کہیں ہوں، تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے، وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد اور قرا^ن کا مبطع ہے، اس لئے دور دراز مسافروں سے دلولہ و رشوق کے بازوؤں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں، تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرخسہ ابلنے لگتا ہے، اور اُن کے دل میں اسلام کے

وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے، اس کو وہاں اسلام اپنے خاص وطن میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدن کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اُس کو اپنے خاص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، اگر دو پیش آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا ختم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ملک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے، جس طرح نوآبادیوں کے رہنما کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مڈر لینڈ) کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطار، نیوزیلینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زیمبارہ اور آفریقہ اور کینیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ اُن کی نگاہ میں اس وسیع برطانی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے، وہ اُن کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں، تو اپنی خاص اور بے میل تہذیب، اخلاق، اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں، وہ اس کے ایک ایک درودیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت اُن کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں، جو دوسرے ملکوں، قوموں، اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے نکلے فرسودہ اور پتھر مردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آکر اپنی خاص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں، بلاشبہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں، ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اُس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے،

زفرق تابعم ہر کجا کہ می نگہم،

کر شمشہ دامن دل کی شد کہ جا اینجاست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کتبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں، تاکہ بیان اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آکر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور ریح ایمانی کو تازہ کر سکیں، قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو "ام القریٰ" یعنی "آبادیوں کی ماں" کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل، و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے،

تاریخیت - اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عربی اور حرم پاک کے ذذہ سے تریب ہوا ہے، آدم سے لے کر ابراہیم تک اور ابراہیم سے لیکر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تعلق ارض حرم کے گود و صحر اور دیوار سے ہے، یہیں حضرت آدم نے سکونت کی، اور غرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حوٰئے اکران سے ملاقات کی، یہیں نورج کی کشتی سے اکر دم لیا، حضرت ہود اور حضرت صالح نے یہاں پناہ لی، حضرت ابراہیم نے یہاں ہجرت کی، حضرت اسماعیل نے یہیں سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ولادت پائی، یہیں وہ پہاڑی بہت (صفا) جہان حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اپنے گدھے چوڑا کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی بہت (مروہ) بس پر اپنے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہ کو پیاس کے عالم میں نظر آیا، یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انھوں نے خدا کے آگے سر جھکا ہے، اسی کے قریب یعنی، مشرق حرام، اور غزوات میں، جو شہر اشدین

ہیں وہ پتھر (جر اسود) ہے، جو ابراہیم و اسماعیل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہاں ملت ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے، جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، یہیں وہ گلیاں اور راستے ہیں، جو جبریل امین کے گزرگاہ تھے، یہیں وہ غار حراء ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحنِ حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تڑپنے سال بسر کئے، اور یہی وہ مقام ہے، جہاں براق کے قدم پڑے تھے، اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ انھیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا،

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مِّمَّا فَرَغَ آتَاهُمُ
اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں، ابراہیم
کے قیام کی جگہ، (ال عمران - ۱۰)

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے، تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وہد کرتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے، اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شہداء اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے،

وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا
اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ، (حج - ۲)
کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ کے سبب ہے،
وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ
اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے
عِنْدَ رَبِّهِ، (حج - ۲)
لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے،

خالص روحانیت - "حج کی حقیقت" میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی، اور اس دور

کا نام نہیں، یہ توحج کی روحانیت کی صرف جہانی اور مادی شکل ہے، حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی ہجرت کی کیفیات، اور تاثرات کے مظاہر اور تشلیں ہیں، اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے پہلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ ”حج مبرور“ رکھا ہے، یعنی ”وہ حج جو سرپاکی ہو“ اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلوں کے لئے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت، اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد، اور آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے، اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے،

سَرَبْنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ۝ وَ	اسے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا مسلمان بنادے
مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۝	دسلم) بنا، اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک نسل بنا
وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ	گر وہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝	سکھا، اور ہم پر رجوع ہو، (یا ہم کو معاف کر) تو
	رہندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو

(لقبرہ ۵-۱۵)

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی، ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہو، اس سے ظاہر ہو کہ حج و قربت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر، جہان اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے ظہر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے، اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر، اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیدہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے موٹی کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو، کہ وہ تو اپنے تائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم، لطف و عنایت کا بحر بیکران ہے،

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج اور عمرہ گنہگاروں کو اس طرح معاف

کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سو نے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے، اور جو مومن اس دن (یعنی عوفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے اس کا سورج جب ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عوفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے، اور اپنے اُن بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کتاب ہے کہ جو انھوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا)، "مولا امام مالک میں ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ بدر کے دن کے سوا عوفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا، اور غضبناک نہیں ہوتا، کیونکہ اُس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں، اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جنہیں مخفیانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی **وَارِنَا مِمَّا سَكَنَّا وَتُبَّ عَلَيْنَا** اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا، اور ہماری توبہ قبول فرما کی تفسیر ہیں،

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ **اَللّٰهُمَّ كُنْ لَنَا** خداوند امین حاضر ہوں میں حاضر ہوں کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، ہنسی میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں اُن کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے، اور اس بنا پر کہ **اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ** گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہو، اسی لئے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں،

لے نسائی و ترمذی و تبار و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد کتاب الحج جلد اول ص ۱۶، میرٹھ سنن ابن ماجہ باب ذکر التوبہ،

گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں، اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگون تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں، صدق توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں، ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنگاروں کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا و زاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہیں، جہاں حضرت آدم و حوا نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی جہاں حضرت ابراہیم نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہاں حضرت موسیٰ اور حضرت صالح نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان، ہم گنگاروں کی دعا سے مغفرت کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی، ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے میرا ب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگان الہی پر عرش الہی سے برستار ہا ہے، اور ہر نوزان ابر رحمت در نشان است،

انسان کی نفسیت (ساکالوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہاں پہنچا، اسکی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں، اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑ، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں، بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحبِ اولاد ہونے کے بعد، یا تسلیم

سے فراغت کے بعد، یا کسی نوکری کے بعد، یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد، یا کسی سے
 مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُن کی زندگی کے یہ
 اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں، جہاں سے ادھر
 یا ادھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج و حقیقت اسی طرح انسان کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک
 حد فاصل کا کام دیتا ہے، اور اصلاح اور تنبیہ کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، جہاں سے انسان
 اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کر سکتا ہو، اُن بابرکت مقاموں پر حاضر، اور وہاں کھڑے
 ہو کر، جہاں حبیب اللہ انبیائے کرام اور خاصانِ الہی کھڑے ہوئے، خدا کے گھر کے سامنے، قبلہ کے روبرو
 جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمیت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر مذمت
 اور اپنے گناہوں کا اعتراف، اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شہر
 سے خیر کی طرف، خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے، اور زندگی کا گزشتہ باب بند ہو کر
 اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے
 سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰات نے یہ فرمایا:

من حج لله فلم يرفث ولم يفسق رجع جس نے خدا کے لئے حج کیا، اور اس میں ہوس و

کیومر ولدتہ امّہ، نہ کی، اور نہ گناہ کیا، تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے

اس دن تھا جس دن اُنکی ماں نے اُسکو جنما،

یعنی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی
 بھلائیوں میں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ
 ہے، جو حج کے باب میں ہیں، اور جس کی آخری آیتیں، طواف کی دعا، کا آخری ذکر، ہیں،

لے سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے۔

ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ پھر طواف کے لئے وہیں سے چلو جہاں سے لوگ
وَأَسْتَغْفِرُوا اللَّهَ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ چلے، اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بیشک
فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ سَائِلكُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے
كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ
فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي کہ اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں
الدُّنْيَا وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ کو یاد کرتے ہو، یا ان سے بھی زیادہ، تو بعض لوگ
وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا (حج کی دعا میں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار
حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا ہم کو دنیا میں دے، اور ایوں کے لئے
عَذَابَ النَّارِ أُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور بعض وہ ہیں
مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا
میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے
اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہیں جنکو
اپنی کمائی کا حصہ ملے گا، اور اللہ تمہارے اعمال کا

تیسے جلد حساب لینے والا ہے،

(بقرہ ۴ - ۲۵)

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:-

۱- حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کیلئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے، اس لئے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں، معاملات میں قرض انسان کے سرکا بوجھ ہے، اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس

سبکدوش ہو جائے، اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے،

عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سیکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کرتا ہے، روٹھوں کو مٹاتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔
۲۔ اسلام آج ہر ملک میں ہے، اس لئے ہر ملک کی زبان اسکی زبان ہے، تاہم اسکی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں، اسکا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے،

۳۔ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اگرچہ غاندی بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کیساتھ اسکی اصلی غایت حج کے زمانہ میں ہوتی ہے، جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا، ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید،

۴۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے اس کو خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے، اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے،

الغرض بیچے اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، بینی قومی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے،

جہاد

وَجَاهِدْ فِي اللَّهِ حَتَّى جِهَادِ ۴ (ج - ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا، مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اسکی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس فرضیہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے، اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو توڑ پر دسے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے،

"جہاد" کے معنی عموماً قتل اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، "جہاد" کا لفظ "جہد" سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ افعال اور مضاعفت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اسکے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بندوبستی اور اسکی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی، اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جہانی و دنیوی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی، اہل و عیال کی خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا، اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تہذیب و ان کو راہنہ کرنا، ان کے حلوں کو روکنا، اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں ان کے اکران سے لڑنا پڑے، تو اس کیلئے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک ساکن اور ہمیشہ جاری عبادت ہے،

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک یا کبھی سر نہ ہو سکتی ہے، صرف "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے جنگ میدان میں مداخلت کر دیا ہے،

یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن تعلیم اور شریعت کو لیکر دنیا میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں، بلکہ عمل اور ستر یا عمل ہے، آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ و صیانت اور انبیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد انھیں کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں "جہاد" کا مقابل لفظ "تعود" (بٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے، سورہ

نساء میں ہے،

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِّ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً مَا وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء ۷۴)

مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جہانی معذوری نہ ہو اور پھر بیٹھے رہیں، اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس بیٹھے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے، کہ جہاد کی حقیقت بیٹھے سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے،

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "جہاد" اور "قتال" دونوں ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے، قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں، اسلئے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے، یعنی ہر جہاد، قتال نہیں ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک، قتال اور دشمنوں

سے لڑنا بھی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے اسماء میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی سورہ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں، جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حقارت کے لیے، ہر قسم کی جہانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جو کھون میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے، اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سر بلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت، شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے، اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موعود ہو جائیں، اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جہانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں،

ترقی و سعادت کا یہ گُر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب تکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری ہل، لٹوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف پیاس کی شدت، نیزہ کی انی تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری، اور گھر با سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈکھانہ نہ سکی، اور پھر دس برس تک دینیہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاون میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ
مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان
ثُمَّ لَمْ يَكُنْ يَاقُوًا جَاهِدًا وَّابَاؤُهُمْ
لا ہے، اور پھر اس میں وہ ڈکھائے نہیں، اور
وَالنَّفْسُ هُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اُولَٰئِكَ
خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے

هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات - ۲) جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں،

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَآخَرُوا حَيَاتِهِمْ دِيَارَهُمْ
وَأُذِّنُوا فِي سَبِيلِي وَتُكَلِّمُوا كَلِمَاتٍ
عَنْهُمْ سَيَأْتِيَهُمْ وَلَا جُنْدَهُمْ جُنُودٌ إِلَّا

پھر جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا، اور اپنے گھروں سے نکلتے
گئے اور میری راہ میں ستائے گئے، اور لڑے اور مارے
گئے، میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا، اور ان کو بہشت

(ال عمران - ۲۰) میں داخل کروں گا،

جہاد کی تین اہم چیزیں ہیں: جہاد کے معنی محنت، سعی، بلوغ، اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے، علماء دل کی اصلاح میں "جہاد" کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے، اور یہی کا نام ان کے ہاں "جہاد اکبر" ہے، خطیب نے تاریخ میں حضرت جابر صحابی سے روایت کی ہے، کہ آپ نے ان صحابہ سے جو بھی بھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے، فرمایا "تمہارا انا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوا سے نفس سے لڑنا ہے" حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں، چنانچہ ابن کبار نے حضرت ابو ذر سے روایت کی ہے کہ اپنے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے۔ یہی روایت دہلی میں ان الفاظ میں ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔ یہ تین روایتیں گوشت و خون کے لحاظ سے چندان مستند نہیں ہیں، مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں،

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِتْنَةً لِّكُلِّ شَيْءٍ
مُّسْلِمًا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ

اور جنہوں نے ہمارے بارہ میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے

(عنکبوت - ۷) اور بے شبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے،

اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیروں کے کارناموں کو ذکر کیا ہے، کہ وہ ان شکایات میں کیسے ثابت قدم رہے،

جہاد اکبر
جہاد اصغر
جہاد باطنی
جہاد ظاہری

اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے،

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ
لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ،
اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے
ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے

(عنکبوت - ۱) بے نیاز ہے،

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ "ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں، یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد
کر چکا اور محنت اٹھا، لگاتار ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے، اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے"
یہی مجاہدہ، کامیابی کا ذریعہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورہ حج میں ارشاد ہوا،

وَجَاهِدْ فَإِنِّي إِلَهُ حَقٍّ جَاهِدْهُ هُوَ أَجْبَنُكَ
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكَ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ چاہے، اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی
مِلَّةَ آبَائِكَ ابْرَاهِيمَ، (حج - ۱۰) تمہارے باپ ابراہیم کا دین،

یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا وہی جہاد اکبر ہے، جس پر ملت ابراہیمی کی بنیاد ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و
آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، تہذیبی، نظریاتی، حاکم اور صحیح ابن سنان میں ہے کہ "مجاہدہ
مسلّم نے صحابہ سے فرمایا کہ "المجاہد من جاهد نفسه" یعنی "مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے" صحیح
مسلم میں ہے، ایک دفعہ اپنے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلو ان کس کو کہتے ہو؟" عرض کیا جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں "فرمایا
"نہیں پہلو ان وہ ہے جو غفہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے" یعنی جو اس پہلو ان کو پچھاڑ سکے، اور اس حرابت کو زیر
کر سکے، جس کا اکھاڑا خود اس کے سینہ میں ہے،

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد با علم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق ملائکہ
لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے، تو اس کا فرض ہے کہ وہ

۱۔ بحوالہ کنز العمال، کتاب الایمان جلد ۱ ص ۳۹، ۲۔ صحیح مسلم باب من یکلم نفسه عند الغضب جلد ۲ ص ۲۹۶ مصر،

اس سے دوسرے تاریک دنوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیں سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیں
دربہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ،

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ ۚ

الْحُسْنَىٰ وَجَادِ لِمَنْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ

طرح سمجھا کر دے، اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے

اسلوب سے کر

(غل - ۱۶)

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے، اور اسی طریقہ دعوت کا نام
”جہاد باقرآن“ ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیں، اپنی آپ مواعظت، اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے
ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو روحانی جہاد، یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دیکھی
اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا،

فَلَا تَطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ ۚ

تو کافروں کا کمانہ مان، اور بذریعہ قرآن کے تو ان

جہاد کر بڑا جہاد،

جہاد اکبیر (فرقان - ۵)

بذریعہ قرآن کے جہاد کو یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد اکبیر بڑا
جہاد اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے، علما نے
بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے، اور اس کو جہاد کا اہم نشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابو بکر رازی حنفی نے احکام القرآن
میں اس پر لطیف بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے، ایک
ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل، فہم، علم اور بصیرت چاہل کرے اور ان کو

لے احکام القرآن رازی مصلحین جلد ۳ ص ۱۱۱،

اس راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس نے حاصل کر کے ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائیگا، یہ علم کا جہاد ہے، جو اہل علم پر فرض ہے،

۳- جہاد بالمال،

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جہاد و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و سائش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہیں، اس لئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سی سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں، اور انھیں سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آراے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے،

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَآخِزُوا جِهَادًا وَجَاهِدُوا

بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (انفال-۱۱) مال اور جان سے جہاد کیا،

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تہیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ یہ منسلک کمین جہاد کا حکم ہوگا، جہاں اب جہاد بالمال کا ذکر نہ ہوا، اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشنا گیا ہے، جیسے

إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ

وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلنا اور اپنے مال اور

اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (توبہ - ۶) لئے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ
تَزَلُّوْا لَكُمْ يَنْتَابُوْا وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُوْلٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر
اس میں شک نہیں کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان
سے خدا کے راستہ میں جہاد کیا یہی سچے اترنے والے

(ہجرات - ۲) ہیں،

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ
عَلٰى الْاَقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً (نساء - ۱۳)

اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے
بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے،

اس تقدّم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں،

میدان جنگ میں ذاتی اور جہانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں لیکن مالی شرکت ہر ایک کیلئے آسان ہے،
جہانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر گھنٹے
انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اُس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے،

گر جان طبعی مضائقہ نیست گر زر طبعی سخن درین است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

۴۔ جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی اپنی جان و مال و دماغ کی قربانی

صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ
ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دیجائے، ارشاد ہوا کہ تمہارا جہاد نیک حج ہے، کہ اس مقدس سفر کیلئے
سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صفت نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر حضرت
اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا

لے صحیح بخاری کتاب الجہاد،

تھارے ان باپ ہیں، عرض کی جی ہاں، فرمایا فیہما لجاہد، تو تم انہیں کی خدمت میں جاؤ کہ تمہیں ان باپ کی خدمت کرنا بھی جاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے انہار میں بے باک ہونا بھی جاد ہے، آپ نے فرمایا،

اِنَّ مِنْ اعظمِ الجہادِ کلمۃً عدلٍ عند
ایک بڑا جاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف
سلطان جائز، (ترمذی ابواب الفت) کی بات کہہ دینا ہے،

۵۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جاد کرنا جاد کے اُن تمام اقسام کو شامل ہے جنہیں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ اُٹھے اور وہ حق کی مخالفت پر اُٹھ جائیں تو اُن کو راستہ سے ہٹانا، اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے سکون بخش دیجائے یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دیجائے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
جو خدا کی راہ میں مارے گئے، اُن کو مردہ نہ کہو، بلکہ
بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُوْنَ،
وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا احساس نہیں،

(بقرہ - ۱۹)

اَلْاَمْرَانِ مِنْ اَنْ جَانِزُونَ کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے،
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيلِ اللَّهِ
جو خدا کی راہ میں مارے گئے، اُن کو مردہ گمان نہ کرو
اَمْوَانًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُزَوِّجُوْنَ
بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس اُن کو
فَرِحَیْنِ بِمَا اَنْهَضَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيُبَشِّرُوْنَ
روزی دیا جا رہی ہے، خدا نے اُن کو اپنی جوہرانی

سید ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد،

بِالَّذِينَ كَفَرُوا بِعَهْدِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَكْثَرُ
عطا کی ہے اس پر وہ خوش ہیں اور جو اب تک اُن سے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں اُن کو
(ال عمران - ۱۷)

ان جان نثاروں کا نام شہریت کی اصطلاح میں شہید ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہیں،
ہرگز نہ مردانہ دش زندہ شد عشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام

یہ اپنے اسی خونی گلگون پیراں میں قیامت کے دن اٹھیں گے، اور حق کی جو علی شہادت اس زندگی میں انھوں
نے ادا کی تھی اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے، وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ (ال عمران - ۱۷)
اسی کے ساتھ وہ جاننا بھی جو گواہ بنا سکیں پر رکھ کر میدان میں اترے تھے لیکن اُن کے سر کا ہدیہ دربار الہی میں اس وقت
اس لئے قبول نہ ہوا، کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسن نیت کے بدولت رضا
الہی کی سند پائیں گے، اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے غازی کے لقب سے یاد کرتے ہیں،

وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلْ اَوْ يُقْتَلْ
اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے پھر وہ یا مارا جاتا ہے
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (نساء - ۱۰)
یا وہ غالب آتا ہے تو ہم اُس کو بڑا بدلہ عطا کرینگے
فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ
تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھر وں
وَاُوْدُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقُتِلُوْا قُلُوْا الْكُفْرَ
سے نکالے گئے، اور اُن کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں
عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا ذُنُوْبُهُمْ جُنُحٌ تُحِجُّ
اور وہ لڑے اور مارے گئے، ہم اُن کے گناہوں
مِنْ تَحْتِهَا اَلَا تَهْتَفُؤْنَ اَنْ تَاْتِيَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ
کو چھپا دیں گے، اور اُن کو جنت میں داخل کرینگے جس کے
وَاللَّهُ عِنْدَ اَحْسَنِ الثَّوَابِ،
نیچے نہیں ہتی ہونگی، خدا کی طرف سے اُن کو بڑا ملے گا
(ال عمران - ۲۰)

اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے،

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جہن
 شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور غور کے عقیدے
 نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھو تیرہ
 برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے
 اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان میثاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ ”مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، اور دوبارہ مجھے زندگی ملے، اور میں اسکو بھی قربا
 کر دوں، اور پھر تیسری زندگی ملے، اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کر دوں“، ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ
 ڈال لیجئے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں، بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ میں، میں مارا جاؤں، اور پھر
 زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے، اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

دائی جہاد | یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جسکو آتا بھی ہو تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہو، مگر حق کی راہ میں دینی
 جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر شوق پر یہ فرض ہو کہ دین کی حمایت، علم دین
 کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، یہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف نہی عن المنکر، اقامت
 عدل اور نظام اور احکام الہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سرکن ایک جہاد
 بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۃ آل عمران کی جہن بنہا کے مسلسل احکام میں آخری آیت ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَاصْبِرُوا بِرُؤُوسِكُمْ لِطُغْيَانِ
 وَالْفُجُورِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَقْلِحُونَ ۝ (آل عمران - ۲۰)

اے ایمان والو! سختکامیابی میں ثابت قدم رہو، اور مقابلہ
 میں مضبوطی رکھو اور کام میں لگے رہو، اور خدا سے ڈرو،

یہی وہ جہاد محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزگی کا نشان ہے۔

لے میحکم کتاب الجہاد

عبادات قلبی

یہ اسلام کے ان عبادات کا بیان تھا جو جہانی و مالی کمالات ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق ماحول و نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے، کہ اسلام میں ہر نیک کام عبارت ہے، اس لئے تمام امور خیر خواہ وہ جہانی، یا مالی، یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہانے صرف جہانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیہ نے جہانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اہل یہ ہے کہ فقہانے اپنا فرض منصب صرف جہانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ توفیق کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرایض کو بتانا ہے، جنکی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں انکی اہمیت کا پتہ چلتا ہے،

اس قسم کے چند فرایض جنکا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اعتقاد، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرایض ہیں، جنکا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور اسی لئے ان کا نام قلبی عبادات رکھا جاسکتا ہے، یہ وہ فرایض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اہلی جو ہر بن جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جنہر اسلام نے اس قدر زور دیا، جو جد بے روح بناتے ہیں، یہ بات گو بیان بے عمل نہ مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور

دوسری طرف اعمالِ تقویٰ کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے،

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تیز نیکی غش ہو، یہ تقویٰ ہے، پھر اس کام کو خداے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش نہ آئیں، یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے، اور خدا سے اس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے براچاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ صبر ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے، تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، اور جسم و جان و زبان سے اسکا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ شکر ہے، ذیل کی سطروں میں ہی اجمال کی تفصیل آتی ہے،

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام | اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اسکو کی غایت ہے، تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں ہی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اکی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں،

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ . (سورہ - ۱) یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے،

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا ہی تقویٰ کا حصول ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي

خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (تیسرا) پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو تاکہ تم تقویٰ پاؤ،

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے،

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
تہر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے
مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقراءہ - ۲۳)

حج کا مشابہی یہی ہے،

وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى
اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی
الْقُلُوبِ (حج - ۴) غرت کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے،

قربانی بھی اسی غرض سے ہے،

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومًا وَلَا دِمَآؤًا وَلَكِنْ
خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا،
يُنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (حج - ۵) لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے،

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہئے،
أَقِمْنَ أَسْسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ (توبہ - ۱۳) جسے اپنی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی،

لَمَسْجِدٍ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ (توبہ - ۱۳) البتہ وہ مسجد جسکی بنیاد تقویٰ پر قائم ہو گئی،

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے،
وَتَذَرُوا ذُلًّا خَيْرَ الزَّادِ لِلتَّقْوَىٰ (بقراءہ - ۲۵) اور سفر میں زاد راہ لیکر چلو اور سب اچھا زاد راہ تقویٰ ہے

ہمارے زیب زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھکر تقویٰ کا لباس ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف - ۳۱) اور تقویٰ کا لباس وہ سب سے اچھا ہے،

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے،

وَأَنْ تَعْلَمُوا أَقْرَبَ لِلتَّقْوَىٰ (بقراءہ - ۳۱) اور معائنہ کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے،

إِعْدُوا لَهُمْ أَقْرَبَ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ - ۲) انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے،

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ
اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ کرو، تو یہ بڑی ہمت کی

الْاُمُوْر، (ال عمران - ۱۹) بات ہے،

وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوْا بَيْنَ النَّاسِ، (بقہ - ۲۸) اور تقویٰ کرو، اور لوگوں کے درمیان صلح کرو،

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
اور اگر اچھے کام کرو، اور تقویٰ کرو، تو اللہ تمہارے

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا، (نساء - ۱۹) کاموں سے خبردار ہے،

اہل تقویٰ تمام اخروی آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں نہیں تقویٰ والوں کا حصہ ہے،

نعمتوں کے مستحق ہیں

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَادِرٍ اَمِيْنٍ (دعائے شہدہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ وَنَعِيْمٍ، (طور - ۱) بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ وَعُيُوْنٍ (ذاریہ - ۱) شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ وَنَضْرٍ (قدر - ۱) بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نھروں میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ طُلُلٍ وَعُيُوْنٍ، (موسلا - ۱) بلاشک تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے،

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتٍ النَّعِيْمِ (ن - ۲) یقیناً تقویٰ والوں کے لئے انکے پروردگار کے پاس نعمتیں ہوں گے،

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَعَارِا، (نباء - ۲) بے شبہ تقویٰ والوں کے لئے کامیابی ہے،

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ حَسَنَ مَا يَرْجُوْنَ، (ص - ۱۱) لاریب تقویٰ والوں کیلئے بازگشت کی اچھائی ہے،

کامیابی اہل تقویٰ کو بظاہر ابتدائیں اہل تقویٰ کو کسی قدر نصیبیتیں اور بائیں سپیش آئیں، یا بہت سی حرام اور کیلئے ہے،

مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت

سی ناجائز کوششوں اور ناروار استوں سے پرہیز کرنا پڑے، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت

عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو

کامیابی سمجھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ

کر لینا چاہئے، حالانکہ جو جتنا دور ہیں، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے حقیقی دور ہیں اور عاقبت اندیش وہ ہیں، جو کام کی اچھائی بڑائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ آخرت کے دائمی اور دیر پا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمرات پر رہتی ہے، تو دنیا بھی اُن کی بنی ہوئی ہے، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انھیں کی قسمت میں ہوتی ہے، فرمایا،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (اعراف-۱۵) اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لئے ہے،
 إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود-۲۱) بے شبہ انجام کار تقویٰ والوں کیلئے ہے،
 وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ (زخرف-۳۲) اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کیلئے ہے،
 وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى (طہ-۸) اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے،

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں | یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی اُن کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے،

إِنْ أَوْلِيَائِهِ إِلَّا الْمُتَّقُونَ (انفال-۲) تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں،
 فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (آل عمران-۷۷) تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے،
 إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ-۱) اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے،
 وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ (بہانہ-۲) اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے،

میت الہی سے سرفراز ہیں | یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے،

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ، (بقرہ ۲۳) اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ، (توبہ ۱۸) اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ والوں کیساتھ ہے

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو ایک کام ہزاروں اغراض اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے، مگر ان میں حاصل ہے اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام

انجام دیتے ہیں، فرمایا،

إِنَّمَا يَقْبَلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ، (مائدہ ۶) اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے،

اسی لئے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلفریزی نصیب ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی تقویٰ والے کون ہیں یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی احکام کی روح ہے، اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لئے ہیں، یہ جانتا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں قرآن

پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے، جو سورہ زمر میں ہے،

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ، لَهُمْ مَّا يَشَاءُونَ

عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ، (زمر ۴) وہ ہے جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ، اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے، اور اس ابدی سچائی

کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت، اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹتا نہیں

لیکن اہل تقویٰ کا پورا احلیہ سورہ بقرہ میں ہے،

وَلَكِنَّ الْإِنْسَانَ آمِنًا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا، اور اپنا مال

عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں
وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ مانگنے والوں کو اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا،
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ اور نماز کو برپا کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کر کے
بِعَهْدِهِمْ إِذْ عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں، اور سختی، تکلیف،
فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ اور بلائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں جو
الَّذِينَ صَدَّقُوا، وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقہ ۲۷۷) سچے ٹھہرے، اور یہی تقویٰ والے ہیں،

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام علیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا، اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں،

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے، تقویٰ اصل میں دُتُوٰی ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے، اور لحاظ کرنے کے ہیں لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی غلطی اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اسکی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے،

وَمَنْ يُعْظَمْ شَعْرًا بِرِ اللَّهِ فَإِنَّهُ مِنَ النَّفَّاسِينَ اور جو شعائر الہی کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلوں کے
تَقْوَى الْقُلُوبِ (حج - ۴) تقویٰ سے ہے،

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اہلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا، اور شعائر الہی کی تعظیم سے ان کو متحرک کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے،

إِنَّ الَّذِينَ يَعْصُونَ أَمْرًا تَعْمَدُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَمَّحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ فِي جَهَنَّمَ وَاجِرٌ عَظِيمٌ (سجرات - ۱)

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے،

فَالصَّابِرِينَ هُمْ أَجْرُهُمْ وَمَا يَسْتَوُونَ (النمل - ۱)

فوری طور پر ہے کہ گنگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل اصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرۃ و ولایت میں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے مگر ہر حال یہ دونوں الہام ربانی ہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لئے یہی تقویٰ کا مقام تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتغال دلائے، اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیسیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحق روش کو تقویٰ فرمایا،

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ

حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ

عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ

كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَكُهَا، (فتح - ۲۶) وہی تھے اس کے لائق، اور اس کے اہل،

بیان جنگ و خواریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے ختم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفا سے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ واسے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے،

امتیازی سیار قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہے، اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے یہ آواز بلند یہ اعلان کیا،

جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۝

اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۝

ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک

(حجرات - ۲)

سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا، اَلْکُوْمُ التَّقْوٰی یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کافروں کو گوروں پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔"



اخلاص

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اسکی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے،

الاولان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت

ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب

صلح الجسد کلۃ واذا فسدت فسد

وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے، اور و

الجسد کلۃ الاولیٰ القلب

خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو

کہ وہ دل ہے،

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود دنیا کی نیش و جلب منفعت، طلبِ شہرت یا طلبِ معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے،

فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ، اَلَا لِلّٰهِ

تو انہی کی عبادت کو خالص کرتے ہوئے اطاعت گزار رہنا

لے صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرأ لدنہ، وصیو مسلم باب اخلاص اللہ وترک التبعات،

الدِّينِ الْخَالِصُ (زمر-۱)

کو اُسی کیلئے ہتھیار کہ اللہ ہی کیلئے ہے خالص اطاعت گزار

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گزار ہی میں خدا کے ہو کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر یا مٹی کی صورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا،

أَرْأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ

کیا تو نے اُس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو

اپنا خدا بنالیا ہے،

(زمر-۲۷)

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے،

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا

کہدے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گزار ہی کو اللہ

لَهُ الدِّينَ، وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ

کے لئے خالص کر کے انکی عبادت کروں، اور مجھے حکم

الْمُسْلِمِينَ، قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ

دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار نہ ہوں، کہدے کہ میں

رَسَاقِي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ، قُلِ اللَّهُ أَجْبَدُ

ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، اگر

مُخْلِصًا لِّدِينِي فَأَعْبُدْ وَامَّا شِئْتُمْ مِّنْ

دن کے عذاب ہے، کہدے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا

هُنَّ إِنِّي أَطَاعْتُ كَذَرِي كُوَس كَلْنُ فَاص كَر كُ

ہوں، اپنی اطاعت گزار ہی کو اس کے لئے خالص کر کے

تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر انکی عبادت چاہے کر

دُونِهِ (زمر-۲۴)

قرآن پاک کے سات موقعون پر یہ آیت ہے،

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ،

اطاعت گزار ہی کو خدا کے لئے خالص کر کے،

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو یعنی اس میں کسی ظاہری

و باطنی بت پرستی، اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو، اور اَلَا بُتَغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ اَلَا عَلٰی (۱-۱) یعنی

خدا سے برتری ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو،

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ہم کو کوئی دنیاوی مزد، اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں،

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا

عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ، (شعراء- ۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰)

مزدوری تو اسی پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے،

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا،

يَقَوْمِ إِنِّي كُنْتُ نَذِيرًا لَّكُمْ وَلَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ عَنِ عِبَادَتِي قَوْمٌ مِّنْكُمْ فَمَا لِيَ إِذَا دَعَا إِلَى اللَّهِ وَالْيَوْمِ آخِرِ

أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ، (ہود- ۳)

میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے،

خود ہمارے رسول صلعم کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا، میں تم سے اپنے لئے کوئی مزد و اجرت نہیں چاہتا، اگر چاہتا

بھی ہوں تو تمہارے ہی لئے،

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرِ فَهَوْلَكُمْ إِنِّي

أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

شَهِيدٌ، (سبا- ۷)

گواہ ہے،

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کیلئے

ہے، دوسری جگہ فرمایا،

لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي

الْقُرْبَى، (شوری- ۳)

قرابتداروں میں محبت رکھنا،

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے اس کے لئے وہ تم سے کسی ذاتی

منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابتداروں کا حق ادا کرو، اور آپس میں محبت رکھو،

اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے،

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ أَلا مِنْ شَاءِ
أَنْ يَخْتِئِرَ الِٰهِي سَبِيْلًا،

نہیں مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی

(قرآن - ۵) طرف راستہ پکڑے،

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں،

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمائش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً گناہوں سے گرجا سکتی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اسکی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لئے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزد و اجرت، اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کواد کرتی ہے جنگی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے، ہم جو کام بھی کرتے ہیں اسکی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جسکا ہیولی ہمارے دل کے ارادہ و نیت، اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے صن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اسلئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر غلصانہ غرض و غایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں، تو رات اور قرآن دونوں میں اہل اور قابیل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے اُن میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی، اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرمادیا،

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (مائتہ-۵) خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہیں، انہیں کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے ان کو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں، لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسل فیض پاتے ہوتے ہیں، اور ان کے لئے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰ کے عہد میں فرعونوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا کہ ان دونوں سے انھوں نے عجائب و غرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب و غرائب میں ظاہری نہیں باطنی ضرورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشاً اور بازیگری ہے، اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لئے یہ فیصلہ کرنا
وَلَا يَفْلَحُ السَّاجِدُونَ (طہ-۳) اور جادوگر ہر دم سے بھی آئے فلاح نہیں پائیں گے،

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرب صرف کہانی بن کر رہ گئے، اور موسیٰ علیہ السلام کے ہجرات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔
غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود دل ہو جائیگا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے،

تَوَكَّلْ

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (ال عمران۔۱)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دیگا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہیگا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے، اور مذہبی اباہوں کا دلخوش کن فلسفہ ہے جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں،

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں، اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترکِ عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا،

اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا، اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا، اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدرواح و خدق و خنیں میں سواروں، تیر اندازوں، زرہ پوشوں، اور تیغ آزمائوں کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی،

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو مشورہ کے بعد جب اسے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کرو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تہیہ کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو اور اسے مایوس اور بوسے نہ بنو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جہد و جہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا، اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، (ال عمران میں ہے،

وَسَاءَ مَا يَحْكُمُونَ فِي الْأُمُورِ فَإِذَا عَزَمْتَ	اور کام (یا لڑائی) میں اُن سے مشورہ لے لو، پھر
فَقُولْ كُلٌّ عَلَى اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُؤْمِنِينَ	جب چکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ
إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ	اللہ پر (بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر
يَخْذُ لَكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ	اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا،
مِنْ بَعْدِهِ ط وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے
الْمُؤْمِنُونَ.	بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان

(ال عمران - ۱۷) واسے بھروسہ رکھیں،

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے ہاتھ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مدد کارآمد نہیں ہو سکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے، منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا،

فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ

تو ان منافقوں سے درگزر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ

وَكَيْلًا (نساء-۱۱) اور اللہ ہی کام بنانے والا،

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے، تو منافقوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے، اور فرمایا جاتا ہے کہ ان منافقوں کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو،

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ وَخِصْ

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو شہید کر اور مومنین

جَا حَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ

سے جو تیری پیروی کرے اس کے لئے اپنی شفقت

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِحْتُ قَوْمًا لَّا يَحْكُمُونَ

کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کمانہ مانیں تو کہہ دے کہ میں

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْغَنِيِّ الرَّحِيمِ الَّذِي يَدْعُكَ

تمہارے کاموں سے الگ ہوں، اور اس غلبہ

حِينَ تَقُومُوا تَلْقَاكَ فِي السُّجُودِ

رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو جھک کر دیکھتا ہے جب تم

درات کو اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمدورفت

(شعراء-۱۱) کو لا حظ کرتا ہے،

دشمنوں کے زغمین ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گزار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرات اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، اگر اس میں منافقوں اور کافروں کی مخالفت کو ششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ

اے پیغمبر خدا سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہا

وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۚ وَأَتَّبِعْ

نہ ان، بیشک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے،

مَا يُؤْمِرُكَ إِلَّا بِدِينٍ مِّنْ شَرِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی

بِمَا تَعْمَلُونَ خَيْرًا تَوْكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكُفَى
کیا جاتی ہے اس کے پیچھے، بیشک خدا تمہارے
بِاللَّهِ وَكَيْلًا، کاموں سے خبردار ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور

(احزاب - ۱) اللہ کام بنانے کو کافی ہے،

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو
تم بھی جھک جاؤ، اور مصالحت کر لو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کمین دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے
فریب کا دواؤ کا میاب نہ ہوگا،

وَإِنْ جَحَرُوا لَكَ فَاجْحَرْ لَهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ
اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں، تو تو بھی جھک جا، اور
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يُرِيدُوا
خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا
أَنْ يَتَّخِذَ عَزَاكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ
ہے، اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں
الَّذِي آيَدَكَ بِنَصْرِهِ وَالْمُؤْمِنِينَ، کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے تجھ کو اپنی اور مسلمانوں

(انفال - ۸) کی نصرت سے تیری تائید کی،

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور عظم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو
حق کی تائید کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے،

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَفُصُّ عَلَى بَنِي إِسْرَءِيلَ
بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر
أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ وَإِنَّهُ
کر دیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں، اور بیشک یہ قرآن
لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ إِنَّ رَبَّكَ
مسلمانوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے، بیشک تیرا
يَقْضِي بَيْنَهُمْ حُكْمَهُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ
پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دیگا،
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ
اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ

(نمل - ۶) رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے،

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی شکون میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں فرمایا،

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا قُلْ اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری سنانے والا
مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ اور ہتھیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ میں تم سے
أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ سَبِيلِهِ سَبِيلًا وَتَوَكَّلْ اس کے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا
عَلَىٰ الْحَيَاةِ الدِّينِ لَا يَخْلُفُ کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے، اور اس

(فرقان - ۵) زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں،

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی

دوسرا با اختیار نہیں،

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تو اگر یہ (مخالفین) کہنا نہ مانیں، تو ان سے کہہ دو کہ مجھے
هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ اللہ بس ہے، نہیں کوئی مبدوء، لیکن وہی، اسی پر میں نے
بھروسہ کیا وہ بڑے تخت کا مالک ہے، (توبہ - ۱۶)

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہیے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے،

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكِّمُوهُ إِلَى اللَّهِ اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا
ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی
أُنَبِّئُ، (شوری - ۲) پر میں بھروسہ کرتا ہوں، اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں،

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلی دیتا ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی

پروا نہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو،

كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے

مِنْ نَبِيٍّ أَمَرَ لِقَائَهُمْ الَّذِي
بہت سی قومیں گزر چکیں، تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهْمَ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ
جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے ماننے
قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ
سے انکار کرتے ہیں، کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی
وَالْيَهُ مَتَابٍ (رعد - ۴۷)

مہجور نہیں لیکن وہی اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور
اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے، اور مگر انہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے
کے بعد ان کی شرارتوں سے پرگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیئے،

قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا
کہہ دے وہی رحم والا ہے، ہم اُس پر ایمان لائے، اور
فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ،
اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لو گے کہ کون کھلی گمراہی

(الملك - ۲۰) میں ہے،

جس طرح ہمارے رسول کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مغانفتوں، اور مشکلوں میں خدا پر توکل
اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی تھی
اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبانوں سے علماء اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تنہا
سالہا سال تک کافروں کے زعم میں پھنسے رہے، تو انھوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمادیا

وَأَنذِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ لَقُوهُ
(اے پیغمبر! ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم

إِنْ كَانَ كِبْرُكُمْ مَتَاعًا وَتَنَزَّلُ كِبْرِي بِآيَاتِ اللَّهِ
سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں

فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَ
کے ساتھ میرا صحبت کرنا، تم پر شاق گذرتا ہے تو اللہ پرچنے

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَعُوذُ بِكَ
بھروسہ کر لیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شرکوں کو

عَمَّا تَشَاءُ اقْضُ إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرْ لِي (یونس)

خوب مضبوط کر لو پھر تمہاری تدبیر چھی نہ رہو، پھر کچھ بچو پھر

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ دشمنوں کے ہر قسم کے کدفریب سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرؑ نے کیا ہے؟ اور حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے تہ اور غصہ سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں،

إِنِّي أَشْهَدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ مِنْ دُونِهِ كَلِيدٌ وَفِي جَمِيعِ الْأَنْظُرُونَ، إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ تَمَّ سَبِيلُ كَرِيمٍ سَاحِدٌ دَاوُدُ، پھر مجھے ہمت نہ سہی دے، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے (ہود - ۵)

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے،

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ مِنْ تَوْجِبَتِكَ، مَجْهُونٌ طَائِفٌ هَبْ، كَامِدٌ حَارًا وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ، (ہود - ۸)

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیا جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہئے،

قُلْ لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ نَفْسِهِمْ كَمَدُونٌ سَاحِدٌ دَاوُدُ، لَاسَ لَكَ تَمَّ سَبِيلُ كَرِيمٍ سَاحِدٌ دَاوُدُ، إِنَّا عَمِلُونَ، وَأَنْتَظِرُونَ، إِنَّا مُنْتَظَرُونَ، وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ، (ہود - ۱۰)

زمین کا چھپا بھید اور اسی کی طرف سارے کاموں کا تکیہ لٹایا جاتا ہے، پھر اسکی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ کرو

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و قریب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے، اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ
وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا الْقَوْمِ مَجْرِمًا بَرَاءُؤُنَا
مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ
وَحَدَّثَكُمْ كَلَامَ إِبْرَاهِيمَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
لَا تَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ
مِنْ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا
وَإِلَيْكَ أُنَبِّئُكَ الْفَصِيرُ

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے نیزا بن، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کیلئے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لئے خدا سے دعا کروں گا، مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس توکل کرنا ہے،

(ممتحنہ - ۱)

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصیبت بھیجتے ہیں، لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں، کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم مل تھوڑا ہی سکتا ہے، اسلئے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کار سازی پر ہے،

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ
وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ الْبُوابِ مُتَفَرِّقِينَ
مَّا اَعْنِي تَقَاتُلُ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اِلٰهَكُمْ

اور (یعقوب نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا، اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا، فیصلہ

اَللّٰهُ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ اسی کا ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہئے

الْمُتَوَكِّلُونَ، (یوسف - ۸) کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں،

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیرِ شانِ توکل کے منافی نہیں، حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم اُن کو زبردستی بت پرست بنانے پر مجبور کرتی ہے، اور نہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں،

قَدْ افترينا على الله كذبا ان عذابنا في
مِثْلِكُمْ بَعْدَ اِذْ بَخَا الله مِنْهُمَا وَمَا يَكُونُ
لَنَا اَنْ نَعُوذَ فِيْهَا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ رَبُّنَا
وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا
رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ
اَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ،

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آجائیں جب تم کو خدا اس
سے بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹا باندھا، اور یہ ہم سے
نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اُس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا
پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے
ہر چیز کو سمجھتا ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اسے ہمارے
پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں توفیق کا
فیصلہ کر دے، اور توفی سب فیصلہ کرنے والا ہے

(اعراف - ۱۱) سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادلِ شکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو
خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا،

يَقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْكُمْ تَوَكَّلُوْا
اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ، (یونس - ۹)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لائے ہو، تو اسی
پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو،

اُن کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کیساتھ جواب دیا،

عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ
ہم نے خدای پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار

الظَّالِمِينَ، (یونس - ۹)
ہم کو ظالم قوم کے لئے آزمائش نہ بنا،

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے
جس طرح سرفراز کیا اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ اُن کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے
قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرمادیا ہے،

مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (طلاق - ۱)
جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے،

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میان بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے، اور
دونوں میں قطعی غلطی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں
سے کھائیں گے؟ ع خدا خود میرا سامان است ارباب توکل را،

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں، وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر
ڈالنے کو اُن میں سے کوئی بھی ان منون میں ہے جنہیں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا
مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور پر زور فحشوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور
استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں،
احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلیم کی خدمت میں آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ
میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں، کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائیگا یا اس کو باندھ کر ارشاد ہوا، اسکو باندھ کر خدا
پر توکل کرو، اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے،

ع بر توکل نہ انوے اُشتر بہ بند،

لے یہ حدیث بمقط اعتلھا و توکل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ ص ۱۷) میں، اور قیئدا و توکل شعب الایمان بہیقی میں، اور قیئدا
و توکل خلیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے (کنز العمال جلد ۲ ص ۲۷۲ حیدر آباد)۔

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں، تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے۔ بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پڑھتے رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، کہ مادی اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی، اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار شخص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ یہ وہ ہونگے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بد شگونیاں کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو دعوت اور تعویذ گنڈا کرتا ہے، وہ توکل سے محروم ہے۔ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔ اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ انکو بھی اوڑھ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لئے دلتنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا، (ہود - ۱)

ذمہ ہے،

تو وہ اس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی، اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے، اور نہ ان کو دلتنگی

سے شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں، اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعائوں کا لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا بہت نہیں، بلکہ صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یبق، وکتب لہ رزق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت میں اکثر باریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے، بلکہ جامع ترمذی باب ما جاز فی کراہیۃ ارقی، اہل انطاکیہ میں من الکوی او استرق فہو برئ من التوکل، بلکہ جامع ترمذی ابواب الزہرۃ ۳ و حاکم

ماری ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس

آیت میں ادا ہوا ہے،

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ
اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لئے مشکل سے

مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ، وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ
نکلنے کا راستہ کر دے گا، اور اس کو وہاں سے روزی

عَلَى اللَّهِ فَصَوِّحْ لَهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ
دیگا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا، اور جو اللہ پر پھروسہ کرے گا

قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا،
تو وہ اس کو بس ہے، بیشک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر

رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے
(طلاق - ۱)

اور پرکی تفصیلات سے ہو رہا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آجکل کے اخلاقیات

میں "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جنہیں یہ جوہر پایا جاتا ہے،

لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڈھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام

نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطروں سے محفوظ رہتا ہے،

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۱۰)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو ہر تو پر دے ڈال رکھے ہیں، وہ اُن کے نزدیک بے بسی و بیکسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب انتقام نہ لے سکتا ہیں، لیکن کیا واقعی یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی "رکنا" اور "سہارنے" کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اسکو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرات اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰ اور حضرت کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت حضرت کہتے ہیں:

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا - وَكَيْفَ

تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا، (کہف - ۹) صبر کر سکتے ہو جبکہ علم تھیں نہیں،

حضرت موسیٰ جواب میں فرماتے ہیں،

سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا، (کہف - ۹) اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے،

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا

پیدا نہ ہونا ہے،

کہاؤ اپنے پیغمبروں کے سمجھانے بچھانے کے باوجود پوری تندی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم

رہتے ہیں، تو اسکی حکایت اُن کی زبان سے قرآن یوں کرتا ہے،

اِنْ كَاذِبٌ لِّیْضَلُّنَا عَنْ اِلٰهِنَا لَوْ لَا اَنْتَ
صَبْرًا عَلٰی كَيْفَا (فرقان - ۴)
یہ شخص (پیغمبری کا دعویٰ) تو تم کو اپنے خداؤں (دینوں)
سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم اُن پر صابر نہ رہتے

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے، یہی مفہوم ایک اور آیت میں ہے اَلْكَافِرَ اَیْنَ مِنْ كُنْتُمْ
اِنْ اَمْشَوْا وَاَصْبَرُوْا عَلٰی اِلٰهِنَا لَوْ لَا اَنْتَ (ص - ۱)
کہ چلو اور اپنے خداؤں پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کیساتھ قائم رہو)

عرب گنوار آنحضرت صلم کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے، ان سے کہا گیا کہ اتنی گھبرا
کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے،

وَلَوْ اَنَّكُمْ صَبَرْتُمْ اَوْ اَحْسٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ
لَكَانَ خَيْرًا لَّكُمْ
اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک
کہ تم (اے رسول) نکل کر اُنکے پاس آتے تو اُن کے

(حجرات - ۱) لئے بہتر ہوتا،

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں متعل ہو ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کمیں
کمیں ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، بایں ہمہ ان سب کامرچ ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت،
صبر کے یہ مختلف مفہوم جنہیں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں،

وقت مناسب کا پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا
انتظار کرنا، آنحضرت صلم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ
پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی
کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جاسے لگیں، تو اس وقت
بشریت کے اقتضائے آپ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام
آیا، کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے

خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آگیا، فرمایا،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا.

(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم

(طہر - ۲)

رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے،

وَاصْبِرْ وَاحْتِجْ بِحُكْمِ اللَّهِ بَيْنَنَا.

تو ثابت قدم رہ کر منتظر ہو، یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے

وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ

اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے

(یونس - ۱۱)

وہ سب سے فیصلہ کرنے والا ان میں بہتر ہے،

وَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ

ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی

(ہود - ۴)

پر بہرہ گاروں ہی کی ہے،

اس انتظار کی کنکاش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی سبکی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈنگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ و لون کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری توقع رکھنی چاہئے،

وَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ.

(دھر - ۴ یونس - ۸۵)

ثابت قدمی کیساتھ منتظر رہ، بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے،

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ میں الجھاؤ

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَفْجُرْ مِنْهُمْ أَيْمَانًا

اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ، اور ان

أَوْ كُفُورًا.

(دھر - ۲)

(نہ ایمان میں) سے کسی گنگناہ یا کفر کا کہنا نہ مان لے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ السلام کا تقہر سنا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آنے

میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اس لئے وہ عذاب

اس سے مل گیا تھا، ارشاد ہوا، کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا سرشتہ چھوٹنے نہ پائے،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ

اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ

کَصَاحِبِ الْحُوتِ، (۵-۲) انتظار کر اور مچھلی دسے (یونس) کی طرح نہ ہو،

بتقرار نہ ہونا، صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو، بلکہ اُن کو خدا کا حکم اور مصلحت جھکے خوشی خوشی جھیل جائے، اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود نیکو دور فرما دیگا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی،

وَالصَّابِرِينَ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ، (حج-۵) اور جو مصیبت میں صبر کریں،

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سُن کر کہ بھڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھالیا، فرماتے ہیں،
بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيلٌ، (یوسف-۲) بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے، تو بہتر صبر جمیل، (اللہ المستعان) علی ما تصفون ہے، اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو،

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سُن کر کہتے ہیں،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ، (یوسف-۱۰) بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے، غفر رب عسی اللہ ان یتبینی بصر جمیعاً، (یوسف-۱۰) خدا اُن سب کو ساتھ لائے گا،

حضرت ایوب علیہ السلام نے جہانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی،

إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ، (ص-۴) ہم نے بیشک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ

خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا،

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں،

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ

اسے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کر گا، خدا نے چاہا تو

مِنَ الصَّابِرِينَ، (صافات-۳) تو مجھے صابروں میں سے پائے گا،

مشکلات کو خاطر میں لانا صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو تکلیفیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں

پہنچائیں، اور مخالفین جو ظن و ظن کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے، اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے، اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹھائے گئے، مگر انھوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آئی نئے دوسری راہ میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا،

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (مدثر-۱) اور اپنے پروردگار کے لئے پامردی (صبر) کر،

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعِزِّ مِنَ الرُّسُلِ (اسے محمد!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پیغمبرِ مہربان آئے

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (احقاف-۴) پیغمبروں نے کی، اور ان (مخالفین) کے لئے جلدی نہ کر،

حضرت لقمان کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مروانہ وار مقابلہ کر،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان-۲) اس کو برداشت کر، یہ بڑی ہمتہ باتوں میں سے ہے،

عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان-۲)

کفار عذاب الہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری سبکی و بے بسی کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دل و روزگار

سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروانہ کر اور نہ ان سے دل کو آس کر، بلکہ اپنے دھن میں لگا رہا اور

دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا،

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَذُكِّرْ عَبْدًا ذَاوُدَ (صل) اُنکے لئے پر صبر کر، اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر،

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے اور انکی طاقت پر بھروسہ کیا جائے،

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ ۖ وَآخِرَ اللَّيْلِ (ملہ ۸-وق ۲) کی حمد کر،

نہ صرف یہ کہ مخالفین کے اس طعن و طنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں ان سے لطف و مروت

برتا جائے،

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاجْهْهُمْ هُمْ هَٰجِرًا
جَمِيلًا (مزمحل ۱) ان کے کئے پر صبر کر، اور ان سے خوبصورتی سے
الگ ہو جا،

در گذر کرنا صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے، او
تکلیفیں سے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل، اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے قرآن پاک کی کئی جہتوں
میں صبر اس مفہوم میں متعال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَإِن عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوبْتُمْ
بِهِ وَلَٰكِنَّ صَبْرًا تَعْلَمُونَ خَيْرًا لِّلصَّابِرِينَ،
وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۖ وَاصْذَكِّرْ
عَلَيْهِمْ، وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ

اور اگر تم عتاب دے تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی
اور البتہ اگر صبر برداشت کرو تو صبر کرنے والوں
کے لئے یہ بہتر ہے، اور تو صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں
لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ کر، اور نہ انکی

(غل ۱۶) سازشوں سے دلنگ ہو،

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار
دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ
صرف خدا کے لئے ہو،

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ
اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَاتَّقُوا يَوْمَ تُرْفَعُ السُّورَةُ أُولَٰئِكَ رُحَمَاءُ
 سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرُؤُونَ بِالْحَسَنَةِ
 السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَصُّ صَافِي الدَّارِ
 فرشتے اُن کو مبارکباد دینگے اور کہیں گے،
 سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى
 الدَّارِ (درعد - ۳)
 کیا، اور نماز پڑھنے کی اور جو ہم نے اُن کو روزی دی
 اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا
 اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت کا
 تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا
 انجام کیا اچھا ہوا،

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر،
 نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، اور
 صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہی کیونکہ یہی اہل ہے جس میں یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائیگا
 مصیبتوں کو بھی جھیلے گا، اور دشمنوں کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دیگا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح
 بھی کر دی گئی ہے، کہ درگزر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جس میں صبر ہوگا،

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ
 بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَ
 بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا
 يُلْقِيَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِيَا إِلَّا
 دُحُوطٌ عَظِيمٌ (فصلت - ۵)
 بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی
 سے دو، تو کیا رہے گی جس کے اور تمہارے درمیان
 دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائیگا، اور یہ
 بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں، اور یہ اسی کو
 ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے،

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہوگا
 اس لئے ایک صاحبِ عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت
 کرے، اور معاف کر دے، فرمایا،

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ
وَيَسْعُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ
إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (شوریہ ۴۱)

راستہ انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ملک
میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لئے پُر درد
عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت کیا، اور بخش
دیا، بیشک یہ بڑی ہمت کا کام ہے،

ثابت قدمی | صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور
ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو اس صفت
سے متصف ہوئے، صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے کہ انھوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا،
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَ
حِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ ۲۱۷)

اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی دکھانے والے) مصیبت
میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں
جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہیں،

اگر لڑائی پڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد
و موافقت، اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا الْقِيَمَةُ نَزَلَتْ
فَاتَّبِعُوا أَوْذَكُمْ وَاللَّهُ كَثِيرٌ عَلِيمٌ فَلْيُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا
فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (انفال - ۶)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو، تو
ثابت قدم رہو، اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح
پاؤ، اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو،
اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم سست ہو جاؤ گے
اور تمھاری ہوا اُکھر جائے گی، اور صبر دکھاؤ، بیشک
اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے،

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ

کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دیدی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثاروں کو سکھادیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ
اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار
إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا
اگر یہ بیس صبر والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب
مِائَتِينَ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ
ہونگے، اور اگر تلوہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب
الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ، لَآ أَن
ہونگے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تم سے
خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا
تخفیف کر دی، اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری
فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ
ہے، تو اگر تلوہ صبر والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو
وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ
پر غالب ہونگے، اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ،
پر خدا کے حکم سے غالب ہونگے، اور اللہ صبر کرنے والوں

(ثابت قدموں) کے ساتھ ہے،

(انفال - ۹)

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طاہر اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے،

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ
طاہر اور جالوت کے سپاہیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت
قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا بِاللَّهِ كَذِبٌ
اور اُس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں انہوں نے
فِتْنَةٌ قَلِيلَةٌ غَلَبَتْ فِتْنَةَ كَثِيرَةٍ بِإِذْنِ اللَّهِ
جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ، وَلَمَّا بَدَرُوا الْجَائِشَ
توڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد
وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أفرغ علينا صبراً
کے لوگوں پر غالب آئے ہیں، اور خدا صبر و ثبات

وَنَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ

دکھانے والوں کے ساتھ ہے، اور جب یہ جاوت

اور اسکی فوج کے مقابلہ میں آئے، تو بولے اے

پروردگار ہمیں صبر دے، اور ہم کو ثابت قدمی بخش، اور ان

(بقرہ - ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل القوت مسلمانوں کی کامیابی کی بھی شرط رکھی ہے، اور بتا دیا ہے کہ خدا انھیں کا

ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں،

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنَّا بَعْدَ

پھر تیرا پورا دگار ان کے لئے ہے جنھوں نے ایذا

پانے کے بعد گھبراہٹ چھوڑا، پھر اُٹتے رہے، اور صبر و

(نحل - ۱۴)

ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے،

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل

کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰؑ نے انکو پہلا سبق سکھایا

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو، اور

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

صبر و استقامت سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ،

وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک

(اعراف، ۱۵)

بناتا ہے، اور انجام پر ہیزگاروں کے لئے ہے،

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی اس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم

لیکن جب انھوں نے بہت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو ان کی ساری

مشکلیں حل ہو گئیں، اور کثیر القوت دشمنوں کے زمرہ میں چھپنے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر

قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ

صبرِ مین ظاہر کیا ہے، فرمایا،

وَأَوْزَنَّا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَفُونَ اور اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کی
مَشَارِقِ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا الَّتِي بَارَكْنَا وراثت بخشی جہین ہم نے برکت نازل کی ہے اور
فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي ترے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق
إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَوَدَّعْنَا مَا كَانَ مین اُن کے صبر و ثبات کے سبب پوری ہوئی
لِيَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا لِيُعْرِضُوا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو

(اعراف - ۱۶) اور تعمیر وں کو برباد کر دیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لئے سر بلند ہوئی کہ اس نے
صبر اور ثبات قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت
عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی،

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يُقَدُّونَ بِأَمْرِنَا اور بنی اسرائیل مین سے ہم نے ایسے پیدا بنائے
لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ، جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے جب انھوں نے
(سجدا ۵-۳) صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے،

آیت بالانے بنی اسرائیل کی گزشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں، ایک احکام الہی پر یقین اور
دوسرے ان احکام کی بجا آوری مین صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں،
پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشت یقین، اور پھر اُن اصول کی تعمیل مین ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو
خوشی خوشی جھیل لینا،

غزوہ احد مین مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ شرمسلمان خاک و خون مین لٹھڑ کر رہ خدا مین جانین دیتے
ہیں بعض مسلمانوں مین اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اُن کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لئے

پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد اُن کو سناتا ہے،

وَكَايْنِ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رَاقِبِيَّتٌ
كَثِيرٌ، فَمَا وَهُمْ أَلَمَّا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ
وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَامُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ
الصَّابِرِينَ، وَمَا كَانَ قَوْلُكُمْ إِلَّا
قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا
فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَالصِّرَاطَ
عَلَى الْفَقْهِرِ الْكَافِرِينَ،

اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا
کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا
انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ اُنکے دل ہلے
ہوئے، اور اُن ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوسرے
رکھتا ہے، اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے
پروردگار ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری
زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ

(ال عمران - ۱۵) اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما

اس آیت پاک نے غلط فہمیدین کے اُن تو بر تو پر دون کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر
پڑے ہیں، اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بیکی کے مجبورانہ درگزر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی
قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے،
ایک مابریک کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد
پر جاد رہے، اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے تصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف)
سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے، اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخٹھے، اسی لئے اللہ
تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے
مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا،

دنیا کی فتنہ بازی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جہاں نامِ جنت ہے انھیں کے حصہ میں ہے، جن کو یہ پامردی، دل کی
مضبوطی، اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اُن

کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

أَفَحَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ
اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمِ

الصَّابِرِينَ، (ال عمران - ۱۴۰) ہیں اور جو ثابت قدم (مبار) ہیں،

ضبطِ نفس | اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے
دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا، اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، مگر یہی ضبطِ نفس کا اصلی موقع ہوتا
ہے، اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، استانت، وقار، اور کیر کڑ کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے،

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت تو ام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر
قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فروغ و رپیدانہ ہو، اور غم و تکلیف
میں وہ ادا اس اور بدول نہ ہو، دل کے ان دونوں عیون کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کے
راز دار کا کتاب ہے۔

وَلَكِنْ أَذَقْنَا لِنَاسٍ مِمَّا رَحِمْنَا شُحًّا

نَزَعْنَا هَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيُؤْسُّ كَفُورٌ، وَلَكِنْ

أَذَقْنَا لِعِصْيَاءٍ بَعْدَ ضَرَاءٍ مَسْتَهْزِئِينَ

ذَهَبَ السَّيِّئَاتِ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

أُولَئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ

رکھا اور اچھے کام کئے، یہ لوگ ہیں جن کے لئے مغفرت ہے،

(ہود - ۲)

ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا | ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی کر بڑھ کر وہ

مُتَبَرِّہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے مذہبی قرآن و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، بہر حال، اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لئے حکم ہوا،

رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
نَاعِبِدُكَ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِكَ

(مرید - ۴) بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اسکی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے،
وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا
اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر، اور آپ اس پر قائم رہ،

(طہ - ۸)

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے،

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے

ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اُن کو خوشخبری سناتا ہے،

فَوَقَّاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ
نَضْرَةً وَسُرُورًا، وَجَزَّاهُمْ بِمَا صَبَرُوا
جَنَّةً وَحَرِيرًا،

صبر کرنے (یعنی احکام الہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب

(دھر - ۱) سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا،

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریضے کا مون میں شریک نہ ہوں

بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں، اور خدا کی باتوں کو شکر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے

لے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سنا ہے،

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَذُرْفَانِ ۝ ان کو بہشت کا چھروکہ بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار بار خاطر خلاف طبع اور تکلیف و مشقت ہونے

کے باوجود خوشی خوشی صبر کرتے رہے، اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام

ہے سچے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سرسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ

ہو کر دو گناہ ادا کرنا، الو ان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک

موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ میں شہداء کو آرام و راحت جان کر جھیل لینا، سود کی دولت سے

ہاتھ اٹھا لینا جن و جہاں کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمل پیرا

استواری اور پابنداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے، اور اسی لئے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے، جہنم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

مُحِبَّت (حَقَّت) الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُبَّت جنتِ ناخوشی کے کاموں، اور دوزخِ نفسانی لذتوں

(حَقَّت) النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ (صیغہ بخاری کثرتاً) کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے،

(الذائق و صیغہ مسلم، کتاب الجنۃ)

یعنی نیک کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے

وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا میں بڑے سے پر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں، اس

عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکامِ الہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے کسی

قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسبابِ عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھرنے

اور اس وقت بھی مالی حرام کی کثر کے لالچ کے بجائے مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت

کر لے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابروں کو ملی ہے،

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو قارون تھا، اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے، لیکن جنہیں صبر و برداشت کا جوہر تھا ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آبی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو ملک و کاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ زِينَةَ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا يَلِيتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ
إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا
وَسِيكَمُ ثَوَابُ اللَّهِ حِينَ تَمُوتُ أَمِنْ وَعَمَلٍ
صَلِحًا وَلَا يَتَّقُوا إِلَّا اللَّهَ الصَّابِرُونَ،

جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے وہ
بڑے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون
کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے، اور جنہیں علم ملا تھا، انھوں
نے کہا، تمہارا برابر ہے، اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان
لایا اور نیک کام کے سب سے اچھے چیز ہے، اور اس

(قصص - ۸) حقیقت کو وہی پاسکتے ہیں جو صابر ہیں،

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے،

مَاعِنْدَكُمْ يُفْنَدُ وَمَاعِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَ
لَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِحَسَنٍ
مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ، (نحل - ۱۳)

جو تمہارے پاس ہے وہ چمک جائیگا، اور جو خدا کے
پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے، اور یقیناً ہم ان کو
جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں کے

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازین ادا کیا کرو، کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں
کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے، "سکے بعد ہے"

وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ
اور صبر کرو، کہ بے شبہہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی

(ہود - ۱۰) مزدوری ضائع نہیں کرتا،

صبر کے فضائل اور انعامات | یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

إِنَّمَا لَوْ فِي الصَّابِرُونَ أَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، (زمر - ۲) صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی،

جن محاسن اور مجاہدہ صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، اُن میں صبرِ بردباری کا بھی شمار ہے،

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ
وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ
وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّالِحِيْنَ
وَالصَّالِحَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوجَهُمْ وَحَافِظَاتِ
وَالَّذِيْنَ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ كَثِيْرًا وَّ الَّذِيْنَ اٰتٰهُمُ
اَعْدَدَ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد
اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی
کرنے والی عورتیں اور محنت سننے والے مرد (صابرین)
اور محنت سننے والی عورتیں (صابرات) اور خدا کے
سامنے بھگنے والے مرد اور بھگنے والی عورتیں اور
خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں
اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی ننگائیوں
کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی
عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد
کرنے والی عورتیں اللہ نے اُن کیلئے تیار رکھی ہیں معافی

(احزاب - ۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرف
غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اُسکے حاضنین ملتی ہے جو یہی بشارت ایک اور
آیت میں بھی ہے،

الَّذِيْنَ يَّقُوْا رِجْسًا اَنۡ اٰمَنَّا فَاغْفِرَ لَنَا
ذُنُوْبَنَا وَتَجَاوَزَ اَبَ النَّارِ الصَّابِرِيْنَ
وَالصَّادِقِيْنَ وَالْقَنَاتِ وَالْمُتَّقِيْنَ
الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ

(جنت اور خدا کی خوشنودی اُنکو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ
اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے، ہمارے گناہوں
کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے
والے (یعنی سنگھڑائی کی محنت کو اٹھالینے والے) اور

سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا

کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور پھٹی راتوں کو خدا سے

(الاحقران - ۲)

اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے،

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ

بھی دعا پر ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گناہے ہیں جنہیں پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے

تکلیف جھیلنے، اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا، اور چوتھا

راہِ خدا میں خرچ کرنے کا،

فتح مشکلات کی کنجی: بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر اور فرما

کیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے ظلم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہیں

کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول

کرنے کے ساتھ ان کو جہانی دہائی دشواریاں پیش آتیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر ان کو بردا

نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (لقہ ۵-۵) اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں

دور ہوں گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تمواریں اٹھائیں، اور مسلمانوں کے ایمان کیلئے

اعلاص کی ترازو میں تلے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت

وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ، وَكَأَنَّ

پکڑو، بیشک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں)

تَقُولُوا لِمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ آمِنًا

کے ساتھ ہے، اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں

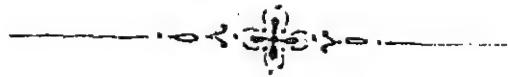
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ، وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ
 بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ
 الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَنَبْشِرُ
 الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابْتُمُ
 مُصِيبَةً قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
 أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ
 وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں اور
 ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور جھوک اور مال و جان اور
 پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے اور صبر والوں
 (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوشخبری سنا دوں
 جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم
 اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جائیں
 یہ لوگ ہیں ان پر ان کے پروردگار کی شاباشیں اور

ہدایاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر

(نقرہ - ۱۹)

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہئے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اُس کو صبر و ضبط
 اور ثابت قدمی سے برداشت کریں، اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر باز گشت اسی کی طرف ہوگی، اس لئے
 حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو ٹٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہئے، اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ
 حیات جاوید کی بشارت ہی ہے،



شکر

وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ، (اعراف - ۱۷)

نُعت میں شکر کے اہل معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہوا اور دودھ زیادہ دے۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے، دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے، یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اُس کے کاموں کا اقرار ہو، اور ہاتھ پاؤں سے اُس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں، شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے، خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے، اور ان کو اُن کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے،

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں، اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اُس کے اقرار اور عمل سے اُس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں کفرانِ نعمت کا لفظ استعمال میں ہے،

یہی کفر وہ نقطہ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کے نُعت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور

نعمتون کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے اُن کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شکاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا، کفر ہے جس کے مرتکب کا نام کافر ہے،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں فقط اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں،

إِنَّا هَدَيْنَاكَ السَّبِيلَ إِنَّمَا شَاكَرُوا قَوْمًا
ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا، (اب وہ) یا شکر گزار
کفوؤا، (دھڑا-۱)

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ
اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے، اور اگر ناشکری
كُفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابَ لَشَدِيدٍ (ابہیم -۲) (کفر) کی توبہ شکر میرا عذاب بہت سخت ہے،

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت، اور دل سے فرمانبرداری کیجائے، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے،

إِنِّي أِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا
در اہل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار
وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ شَاكِرًا لِّأَنْعَمِهِ
اسکو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں
اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ
سے نہ تھا، اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گزار

(نحل -۱۶) اللہ نے اسکو چن لیا، اور اس کو سیدھی راہ دکھائی

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کیجائے، احکام الہی کی پیروی کیجائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا،

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعت الہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی

بنیابر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے اور اسی قدر عظمت اور محبت کے قوی دلی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَدُوِّكُمْ إِذْ شَكَرْتُمْ
وَإِنْ كُنْتُمْ كَانِ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (نساء-۲۱)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کی حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہی، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکر ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیل ہیں، اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہونگے، تو یہ کیا،

وَلَا يَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (اعراف-۲)

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا،

وَسَجَّحْنَاهِ النَّشَاكِرِينَ (ال عمران-۱۵)

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے،

بَلِ اللَّهُ فَاعْبُدْ، وَلَكِنَّ مِّنَ النَّشَاكِرِينَ (زمر-۶)

بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گزاروں میں سے ہو، شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اُس کا بدلہ کر کے اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اور یہی سبب ہے کہ حمد الہی میں اللہ تعالیٰ کے اُن صفات کا ملکہ ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں، اور اسی لئے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا چھوڑ سونے

ہے، سورہ فاتحہ کا پچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورہ فاتحہ سے اور سورہ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے،

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، (فاتحہ-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے،

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں سب کی پرورش اور زندگی اور بقا اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں اور نکھر رہے ہیں اس لئے حمد اسی ایک کی ہے یہ تو دنیا کے نیز رنگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازلِ حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجود زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دو سری دنیا میں اپنی زندگی پا چکیگا، یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے، وہ وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی جس کے لئے خدا نے اس کو بنایا تھا، اس وقت عالم امکان کے ہر گوشہ سے یہ سر ٹی آواز بلند ہوگی،

وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، (زمرہ-۸) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے،

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے،

لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (دورہ-۲) اُسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے،

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں،

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ جوعرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے چاروں طرف

يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ، (مومن-۱) ہیں وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں،

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے،

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِ ۝۴ اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی

تسبیح نہ کرتی ہو،

(نبی اسراء شید - ۵)

میں شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے،

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (رحم، طہ، مومن، طور، فرقان) اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں، مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، عمارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ ان سب کا مثلاً اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اُس کا شکر یہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکر یہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جہانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں اُن کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعمیل میں لگا رکھیں، اور اُن سے اُن کی خدمت کریں جو اس جہانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہیں مثلاً جو اپاہج اور معذور ہوں، بیمار ہوں، کسی جہانی قوت سے محروم ہوں، یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے،

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے،

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَ

بڑی برکت اسکی ہے جس نے آسمان میں برج بنائے

جَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا، وَهُوَ الَّذِي

اور اس میں ایک چرخ اور چاند لگانے والا چاند رکھا

جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنۢ ارَادَ اَنْ

اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک

يَذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُورًا، (فرقان - ۶)

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت دالے کی قدرت تسلیم کریں، اور دن کی روشنی اور چاند کے اُجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں

جس کے لئے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے،

الرَّحِيمُ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی، اور انسان

خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ اولاد کو بے قدر سے پھر سے ہوئے پانی سے بنایا،

مُصَيَّبٍ، ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ پھر اس کو درست کیا، اور اس میں اپنی روح سے کچھ

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ پھونکا، اور تمہارے کان، اور آنکھیں اور دل بنائے

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (سجدا - ۱) تم کم شکر کرتے ہو،

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر

لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا، وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے، اور تمہارے لئے کان اور

وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (غدا) آنکھیں اور دل بنائے،

ان آیتوں میں خلقتِ جہانی کی نعمت کا بیان، اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے

ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریا کی اور کیمائی کو تسلیم کریں، اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی، اور اس

زندگی میں ہم کو یون بنادیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے، اور اس میں بھی ہم کو

یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے، اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جہانی حق ادا کریں بعض

اور آیتوں میں ہے،

كُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا أَمْرًا وَمَعْتَدًا تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ

كَذَلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا تمہاری سے بیکار

ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیے

ہیں، تاکہ تم شکر کرو، (حج - ۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا

رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ، (بقرہ ۲۱-۲۰)

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَ

اشْكُرُوا لِلنِّعْمَةِ اللَّهُ إِنَّ كُنتُم مِّنَ

تَعْبُدُونَ، (غذ-۱۵)

پوچتے ہو

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اسکا شکریہ بھی خدا کو مانکر مال کے ذریعہ ادا کریں،

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم

اس کے ساتھ کریں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جاسکتا

اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان

ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے،

وَاحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ، (قصص-۸) اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نفع و بلا اللہ محتاج نہیں، کہ اسکو کوئی قرضہ دے، خدا کو قرض

دنیا میں ہے کہ اس کے ضرور مند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا، کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے،

(بقرہ ۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷ وحید ۲۰)

وَاقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا، (صد-۲۰ و منزل ۲) اور خدا کو قرض حسنہ دو،

إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا، (تعاون-۲) اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اسکی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہئے،

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمایگا،

لے آدم کے بیٹے بن بیار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار، تو تو
 جان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمایگا، کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان
 بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پریش نہ کی، اور اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمایگا
 اے آدم کے بیٹے بن، میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گیگا اے
 میرے پروردگار، تو تو سارے جان کا رب ہے، میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمایگا، تجھے معلوم نہ
 ہوا کہ میرے فلان بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو
 اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے بن، میں نے تجھے پانی مانگا تو نے مجھے
 پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار، تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، میں
 کیسے پانی پلاتا، فرمایگا، میرے فلان بندہ نے تجھے پانی مانگا، تو نے اس کو نہیں پلایا،
 اگر تو اس کو پلاتا، تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور
 اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہئے؟
 اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ
 خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالانکہ اُن کے لئے نہ کوئی ہمارا
 خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا علمی جو کچھ ملا اسکے فضل و کرم سے ملا، اور جو کچھ ملیگا وہ اسی کی عطا اور
 بخشش ہوگی، انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، دیکھ کر اور اُن کے
 دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے
 شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں، مگر غیب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور کجی کی کوپلین نکلتی ہیں، اسی لئے
 لے صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوا یا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے تاکہ ربوبیت الہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے (اور بار آور بنائے)۔

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے یہ ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قادیون نے کہا تھا، یہی غور ہے جو ترقی کر کے نخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی، اور ارشاد ہوا،

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمُ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُفْتَالٍ فَخُورٍ ۚ ۱۱
 (اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا اس پر اتراؤ نہیں اور
 وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمُ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُفْتَالٍ فَخُورٍ ۚ ۱۱
 اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں
 وَيَا مَعْزُونَ النَّاسِ بِالْأَعْيُنِ وَمَنْ يَتَوَلَّ
 کرتا جو خود کو بخوس ہیں، اور لوگوں کو بھی کوخوس بننے
 فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۚ
 کو کہتے ہیں، اور جو اللہ کی بات سے منہ موڑے گا

(تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد یعنی

(حدید - ۳) حق و خوبی سے مالا مال ہے،

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے، اور نہ اُن کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے،

خدا نے انسانوں پر جو تو بر تو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگاؤ بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس عین کی قدر پہچانے، اُس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے، اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے،

وَرَفَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۚ
 اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دین تاکہ
 (انفال - ۳) تم شکر کرو،

وَهُوَ الَّذِي يَمْشِي عَلَى الْبَحْرِ لَيْلًا وَهُوَ
 اور اسی نے سمندر کو تمہارے پس میں کر دیا کہ تم اس سے

لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُ مِنْهُ حَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا
وَمَنْ مَرَىٰ الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيهِ وَلِيَتَّقُوا
مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ
چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں
کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو بھاڑتے رہتے ہیں
اور تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور تاکہ شکر کرو،

(غل - ۲)

وَكَذَٰلِكَ نَتَنَبَّهُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
(حج - ۵)

اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس
میں کر دیا کہ تم شکر کرو،

وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَكُمْ أُمَّلًا وَأَنْتُمْ لَا تَشْكُرُونَ
لَتَسْكُنُوا فِيهِ وَلَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (قصص - ۷)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے
رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن
کو) اسکے فضل و کرم کی تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر کرو،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا
یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے،

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ
أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (يونس - ۶)

اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے بڑے فضل کئے لیکن
ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں،

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ
فِيهَا مَعَاشٍ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ
(اعراف - ۱)

اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی، اور اس میں
تمہارے لئے بسر وقات کے بہت سے ذریعے
بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو،

اَیْک مَوْعِدٍ پَر تُو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُر محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا،
قُلِ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرًا (عبس - ۱)

مارے جانو! انسان کتنا بڑا ناشکر ہے،

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا،

تو مالک کا شکر ادا ہو گیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، شکر دراصل دل کے اُس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے من سے جنت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں، اور اُس کے لئے سراپا پاس بننے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں، اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہیں، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں، لیکن دل میں احسانندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیفیت نہ ہو، اور اس اثر اور کیفیت کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو، تو ہم اس من کی احسانندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے درپے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کر کے فرماتا ہے،

اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا، (سبا-۲) اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کیلئے نیک عمل کرو

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں،

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ

اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے

اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّْ وَاَنْ اَعْمَلَ

اُس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ

صَالِحًا تَرْضَاهُ، (دند-۲) پر کیا ہے، شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند

اس دعا میں بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر میں، شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے شکر

کرتے جائینگے میں اُن کے لئے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے

جیسے مالک کے شکر کے لئے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب

میں اس کو نئی نئی نعمتیں اور عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لئے فرمایا،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ

اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا،

إِنَّ عَذَابَ لَشَدِيدٌ (ابراہیم - ۲) اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے،

كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ (قمر - ۲) ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا

وَسَجَّزِي الشَّاكِرِينَ (ال عمران - ۱۵) اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے،

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکری کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جانکر اس کو مانے گا، اور اس کے حکمون پر چلے گا اور اس کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کریگا، اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کریگا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ (یعنی جو انسانوں کا شکر ادا نہ کریگا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کریگا) (ترمذی کتاب البر والصلۃ) اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکر یہ ادا نہ کریگا، تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکر یہ اس سے قبول نہ فرمائے گا،



خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہو گئی، ان صفحات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انھوں نے دہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے توڑ پھوٹے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جز ہے، اسکی حقیقت کتنی واضح کر دی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے، اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل، اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل، اور آپ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہو، اور انھیں میں سے ایک یہ ہو کہ آپ کی تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، علمائے صاف اور متعین ہو، اور زمانہ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہو، اور اسکا اس طرح ہونا اسلئے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اسلئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا انہیں اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا، جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا،

صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَیْکَ وَبَرَکَاتُہٗ

س ۱۳۵۲ھ
۱۲ جمادی الثانیہ { منفرت کا طبیب گار
یہد سلیمان ندوی،

طابع و ناشر
محمد امین آفری



20/19

DUE DATE

20

URDU STACKS

10

11

12

13

14

[illegible]